اقبال ریویو

اقبال اکیڈمی حیدر آباد کا رسالہ

مجلہ عثمانیہ میں ۱۹۳۸ء تک شائع ہونے والے مضامین
پر مشتمل خصوصی اشاعت

اقبا ا اکر ڈمی،

"مدینہ منشن"، نارائن گوڑہ باد، اندھرا پردیش (انڈیا)

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا رسالہ

اشاعت۔ اپریل ۱۹۹۴ء

مجلس ادارات

****

جناب مصلح الدین سعدی

جناب ذکریا شریف

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

جناب وجیہہ الدین احمد

جناب محمد ظہیر الدین احمد
(معتمد مجلس ادارات)

مجلس مشاورت

****

پروفیسر سعید اختر درانی
شعبہ طبعیات بر منگھم یونیورسٹی

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی
شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج
لاہور

جناب محمد طارق غازی
مینجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ جدہ

ڈاکٹر معین الدین عقیل
شعبہ اردو جامعہ کراچی

پروفیسر سید سراج الدین
صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد

بدل اشتراک

ہندوستان

فی شمارہ - ۳۰ روپے دو شماروں کے لیے - ۵۰ روپیے

بیرونی ممالک

فی شمارہ - ۴ ڈالر یا اس کے مساوی رقم

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

"اقبال ریویو" دفتر اقبال اکیڈیمی، مدینہ منشن

نارائن گوڑہ حیدرآباد آندھرا پردیش (انڈیا)

پن کوڈ: 29 5000

فون نمبر: 595230

ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر وجیہہ الدین احمد معتمد اقبال اکیڈیمی نے اعجاز پریس چھتہ بازار، حیدرآباد میں چھپوا کر دفتر اقبال اکیڈیمی، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد (آندھرا پردیش) سے شائع کیا۔

--*-*-*-*-*-*-*-*

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

۱۔ اداریہ — وجیہہ الدین احمد۔ — ا

۲۔ حبیب اللہ رشدی۔ ترجمہ — تبصرہ پیام مشرق۔ از اے نکلسن — ۳

مجلہ عثمانیہ جلد دوم شمارہ سوم وچہارم امرداد ۱۳۳۷ف ۱۹۳۸ء۔

۳۔ عبد القادر سروری — اقبال — ۹

مجلہ عثمانیہ جلد چہارم شمارہ اول۔ ۱۳۴۰ف ۱۹۳۱ء۔

۴۔ بلبیر پرشاد بھٹناگر — اقبال کا ذوق آگہی — ۳۲

مجلہ عثمانیہ جلد ہفتم شمارہ اول ۱۳۴۳ف ۱۹۳۴ء۔

۵۔ سکندر علی وجدؔ — اقبال کی غزلیں — ۵۳

مجلہ عثمانیہ جلد ہشتم شمارہ سوم وچہارم ۱۳۴۴ف ۱۹۳۵ء۔

۶۔ سکندر علی وجدؔ — بال جبریل — ۶۱

مجلہ عثمانیہ جلد نہم شمارہ اول و دوم ۱۳۴۵ف ۱۹۳۵ء۔

۷۔ محی الدین قادری زورؔ — فلسفۂ عجم پر تبصرہ — ۸۱

مجلہ عثمانیہ جلد نہم۔ شمارہ سوم وچہارم ۱۳۴۵ف ۱۹۳۶ء۔

۸۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ — اقبال کا اثر اردو شاعری پر — ۸۳

مجلہ عثمانیہ جلد یازدہم شمارہ اول و دوم ۱۳۴۷ف ۱۹۳۷ء۔

۹۔ عزیز احمد — اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر — ۹۱

مجلہ عثمانیہ جلد یازدہم شمارہ اول و دوم ۱۳۴۷ف ۱۹۳۷ء۔

۱۰۔ محمد افضل الدین — آہ! اقبال۔ (اداریہ) — ۱۰۳

مجلہ عثمانیہ جلد یازدہم شمارہ سوم وچہارم ۱۳۴۷ف ۱۹۳۸ء۔

۱۱۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم — علامہ اقبال (منظوم خراج عقیدت) — ۱۰۴

مجلہ عثمانیہ جلد یازدہم شمارہ سوم وچہارم ۱۳۴۷ف ۱۹۳۸ء۔

۱۰۹ ۱۲۔ محمد علی نیرؔ شاعر مشرق۔(منظوم خراج عقیدت)
مجلہ عثمانیہ جلد یازدہم شمارہ سوم وچہارم ۱۳۴۷ف ۱۹۳۸ء۔
۱۱۰ ۱۳۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اقبال کی زندگی کے مختصر حالات
مجلہ عثمانیہ جلد یازدہم شمارہ سوم وچہارم ۱۳۴۷ف ۱۹۳۸ء۔
۱۲۱ ۱۴۔سید فخرالحسن اقبال کی خدمات
مجلہ عثمانیہ جلد یازدہم شمارہ سوم وچہارم ۱۳۴۷ف ۱۹۳۸ء۔

--*-*-*-*-*-*-*-*-*-*

کچھ اس شمارہ کے بارے میں

اقبال اور اقبالیات کی پذیرائی میں حیدرآباد (دکن) کو کئی اعتبارات سے انفرادیت اور اولیت حاصل رہی ہے۔ اس سرزمین سے کئی ایسے نامور ماہرین اقبالیات اٹھے جن کی اقبال فہمی کے ابتدائی دور میں لکھی گئی کتابیں آج بھی درجہء استناد رکھتی ہیں۔ حیدرآباد (دکن) کی اس علمی فضاء کی نشو و نما میں جامعہ عثمانیہ کا بڑا اہم رول رہا ہے جہاں اس گہوارہ علم میں ایسے نامور ادیب نقاد اور شاعر پروان چڑھے جنہوں نے دنیائے ادب میں اپنا سکہ جمایا۔ ان کو نہایت قابل اور دیدہ ور اساتذہ کی تربیت حاصل رہی۔

انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کی جانب سے "مجلہء عثمانیہ" شائع ہوا کرتا تھا (جو اب بھی جاری ہے) اس کا اولین شمارہ جو ۱۳۳۶ف (۱۹۲۷ء) میں شائع ہوا۔ اقبال اکیڈیمی کے کتب خانہ میں موجود "مجلہ عثمانیہ" کے شماروں کے مطالعہ کے دوران یہ احساس ہوا کہ اس وقت زیر تعلیم طلباء کے ایسے اہم مضامین موجود ہیں جو بعد میں اقبالیات پر مرتبہ کتابوں میں شامل نہیں کیے گئے اور اکثر اقبالیات کے طالب علم ان سے ناواقف ہیں۔

مجلہ عثمانیہ کے یہ شمارے اب نایاب ہوگئے ہیں۔ چنانچہ خود عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کی مکمل فائل موجود نہیں ہے۔ اس لیے "اقبال ریویو" کی مجلس ادارت نے یہ طئے کیا کہ ان مضامین کو یکجا کر کے اقبال دوستوں کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اس طرح "اقبال ریویو" کے اس خصوصی شمارہ کے ذریعہ ان مضامین کو پیش کیا جارہا ہے۔

مجلہ عثمانیہ کا پہلا شمارہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ اس سال شائع ہونے والے دو شماروں میں اقبال پر اہم مضامین شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ اس دوران میں شائع ہونے والے دیگر شماروں میں بھی اقبالیات پر اہم اور وقیع مضامین شائع ہوئے۔ اقبال ریویو کے زیر نظر شمارہ میں ۱۹۳۸ء تک شائع ہونے والے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ ریویو کے صفحات کی تعداد عموماً ایک سو تک محدود رکھی گئی ہے لیکن پچھلے شمارہ (مسجد قرطبہ نمبر) کی طرح اس شمارہ میں بھی صفحات کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ لیکن یہ خیال پیش نظر رہا کہ ۱۹۳۸ء تک شائع ہونے والے تمام مضامین یکجا ہوجائیں۔ اس لیے ادارہ نے اس خصوصی شمارہ کا زر تعاون بڑھائے بغیر اس زائد صرفہ کو برداشت کیا ہے۔

ان مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ مضامین ساٹھ، پینسٹھ سال قبل لکھے گئے تھے۔ یہ ایک طرح خود اقبال کے دور حیات میں اقبال کے فکر و فن کے تجزیہ و

تحسین کا اولین دور ہے اور جس کی بعض اہم خصوصیات ہیں لیکن جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے ۔ اس کے بعد مطالعہ اقبال کے رویہ میں کئی اہم تبدیلیاں آئیں ۔ نیز یہ مضامین ان طالب علموں نے لکھے جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں زیر تعلیم تھے اور بعد میں انھوں نے دنیائے ادب میں بڑا نام کمایا ۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اقبال کے شعر و فکر نے طلباء اور نوجوانوں کو کس طرح متاثر کیا ۔ اس میں مذہب اور مسلک کی کوئی قید نہ تھی ۔ اس بات کی تصدیق جناب بلبیر پرشاد بھٹناگر اور جناب پدمانابھ چاری کے مضامین سے ہوگی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں زیر تعلیم تھے ان مضامین کے علاوہ مجلہ عثمانیہ کے مختلف شماروں میں ان بلند پایہ اساتذہ صاحبان کے مضامین بھی شائع ہوئے جن کی خدمات نے اردو ادب میں یادگار حیثیت حاصل کرلی ہے ۔ اساتذہ کے یہ مضامین بھی زیر نظر شمارہ میں شامل ہیں ۔

ادارہ۔ اقبال ریویو جناب عبد الصمد خان بانی اردو ریسرچ سنٹر کا بے حد ممنون ہے کہ ان کے گراں قدر تعاون کی بدولت بعض اہم مضامین کا حصول ممکن ہوسکا ۔

آخر میں ایک اور بات اقبال ریویو کے قارئین اور اقبال کے پرستاروں سے کہنی ہے ۔ فی الوقت اقبال ریویو سال میں دو مرتبہ پابندی شائع ہو رہا ہے ۔ ادارہ کی خواہش تو یہی ہے کہ ریویو کو سہ ماہی بنادیا جائے اور کچھ شمارے انگریزی میں بھی شائع کئے جائیں لیکن فی الوقت اقبال اکیڈیمی کے مالی وسائل اس بات کے متحمل نہیں ہوسکتے ۔ سال میں دو شماروں کی اشاعت پر جو لاگت آتی ہے خود اس کی سبیل بھی نکل نہیں پاتی ۔ اس لیے ادارہ اقبال کے پرستاروں اور اکیڈیمی کے ہمدردوں سے اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ وہ اقبال ریویو کے استحکام کے لیے نہ صرف خود اپنا زر خریداری عنائت فرمائنگے بلکہ اس کی توسیع کے لیے بھی ہر ممکنہ تعاون سے دریغ نہیں کرینگے کہ اس علمی خدمت کی افادیت ہر صاحب نظر پر واضح ہے ۔

وجیہہ الدین احمد

نوٹ :۔ عدم گنجائش کی وجہہ سے اس شمارہ میں اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں کی رپورٹ شامل نہیں کی جاسکی ۔

تبصرہ پیام مشرق مصنفہ سر محمد اقبال

زمانہ حال کے ہندوستانی مسلمان شعرا میں اقبال نے بہت بڑا درجہ حاصل کیا ہے۔ ان کی شاعرانہ قوت کی دو آوازیں ہیں۔ ایک اردو میں بلند ہوتی ہے اور ہندوستانی حب الوطنی کو اکساتی ہے۔ اگرچہ اقبال سیاسی نقطۂ نظر سے قوم پرست نہیں ہیں، دوسری آواز ایران کی خوبصورت اور ترنم ریز زبان میں بلند ہوتی ہے اور اسلامی دنیا کی سامعہ نوازی کرتی ہے۔ حقیقت میں یہ نیا اور جوش دلانے والا گیت ایک آگ برسانے والا سحر ہے جو راکھ اور شعلے اچھال اچھال کر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ "صور پیغمبری" ہے۔

اقبال پنجاب، میں پیدا ہوئے، تعلیم کی تکمیل انگلستان اور جرمنی میں کی۔ مشرق اور مغرب مل گئے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ وہ متحد بھی ہوگئے۔ کوئی شخص خواں وہ کتنا ہی جو ہر خداداد رکھتا ہو یہ امید نہیں کر سکتا کہ وہ ان دونوں تمدنوں سے جو دو مختلف بنیادوں پر قائم ہیں مساویانہ اور مکمل طور پر حصہ لے سکتا ہے۔ اقبال مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے لیکن ان کی طبیعت حقیقت میں مشرقی ہی رہی۔ وہ گیٹے، بائرن اور شیلے سے واقف ہیں ان کو السوا شپراخ زرا تھسترا اور لی او لوشن کرائے تریس سے ایسا ہی ربط رہا جیسا کہ قرآن اور مثنوی سے لیکن وہ یورپی تہذیب کی اساس انسانیت سے کم واقف نظر آتے ہیں اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تنقید اگرچہ ہرگز سطحی نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی وسعت میں ضرور کم ہوتی ہے۔

ان کا فلسفہ جو اسرار خودی اور رموز بیخودی میں بجائے مشکل ہونے کے بیان کیا گیا ہے اس کے اہم خیالات یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں کیونکہ ان خیالات سے تھوڑی سی واقفیت کے بغیر اقبال کی شاعری کا سمجھنا آسان نہیں۔

وہ حقیقت کو عمل تکوین میں تصور کرتے ہیں نہ کہ حالات قیام میں۔ ان کے نظام اشیاء میں ذات مطلق کوئی جگہ نہیں پاتی بلکہ کل کا کل ایک سیلابی حالت میں ہے۔ ان کی کائنات افراد کی ایک محفل ہے جس کا صدر سب سے واحد فرد یعنی خدا ہے۔ ان افراد کی زندگی اپنی شخصیت کے ڈھالنے اور ترقی دینے پر موقوف ہے۔ انسان کامل نہ صرف مادی دنیا پر حاوی ہو کر اس کو اپنے اندر ضم کر لیتا ہے بلکہ وہ صفات الٰہی کو بھی کامل طور پر اپنے میں بھر کر خدا کو بھی اپنے میں ضم کر لیتا ہے۔ پس زندگی کی جان عشق ہے، جو اپنی انتہائی شکل میں تمناؤں اور مقاصد کی تخلیق اور ان کے حصول کی جدوجہد ہے۔ شخصیت کو قوی یا کمزور بنانے کے اعتبار سے تمنائیں اچھی یا بری قرار پاتی ہیں اور مام قدر و قیمت اسی معیار سے قرار پانی چاہیئے۔

نتشے اور برگساں کو ان خیالات سے تعلق ہونے پر زور دینے کی ضرورت نہیں تاہم یہ

ظاہر نہیں ہوتا کہ اقبال اپنے تصوری معاشرہ کو (حضرت) محمد صلعم کے تصور اسلام سے کیوں تعبیر کرتے ہیں یا یہ کہ ان کے اس معاشرہ کا رکن ہونا مسلمانوں ہی کا خاص حق کیوں ہے ؟ یہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے مذہبی جوش نے فلسفہ کو بالکل نکال باہر کیا (یہ ایسا نتیجہ ہے جو منطق کے لحاظ سے غلط ہے لیکن شاعرانہ اعتبار سے بالکل صحیح ہے) اقبال بہ حیثیت شاعر کے عقلیت سے نفرت کرتے ہیں چنانچہ وہ ابن سینا (ابو علی سینا) کا جلال الدین رومی سے اس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔

بو علی اندر غبار ناقہ گم ۔ دست رومی پردہ محمل گرفت (پیام شرق صفحہ ۱۱۲)

حق اگر سوزے ندارد حکمت است

شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

پیام مشرق گیٹے کے دیوان مغرب کے جواب میں لکھی گئی تھی ۔ انتسابی نظم میں امیر افغانستان کو خطاب کر کے اقبال کہتے ہیں۔

پیر مغرب شاعر المانوی •••

آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی

در جوابش گفتہ ام پیغام شرق

ماہ تابے ریختم بر شام شرق

اگرچہ پیام مشرق ظاہری صورت میں دیوان مغرب سے بہت مشابہ ہے اس لیے کہ دونوں میں چھوٹی چھوٹی نظمیں علحدہ علحدہ سرخیوں کے تحت مختلف حصوں میں تقسیم کردی گئی ہیں اور یہ مشابہت اس کے مقصد میں بھی ہے لیکن ان دونوں کی نوعیت مضامین میں کوئی تعلق نہیں گیٹے کی صرف دو نظموں کی بلا واسطہ تقلید کی گئی ہے جو "میدشن اند وشتر" اور "محمدس گسانگ" میں (پیام مشرق میں حور و شاعر اور جوئے آب ہے) (لیکن یہ دونوں نظمیں دیوان مغرب میں نہیں ہیں) "جلال اور گیٹے" کی سرخی والی نظم میں اقبال یہ تصور کرتے ہیں کہ فردوس بریں میں گیٹے جلال الدین رومی (جن کی اقبال سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں) کی ملاقات ہوتی ہے (صفحہ ۲۴۶) مولانا روم گیٹے کی زبان سے فاوسٹ کو سن کر یہ کہتے ہیں۔

گفت رومی اے سخن را جاں نگار

تو ملک صداستی دیزواں شکار

(ملاحظہ ہو نظم جلال و گیٹے ۔ پیام مشرق)

پیام مشرق کے ایک بڑے حصہ کا سمجھنا مشکل ہے اور ترجمہ کرنا اس سے زیادہ مشکل ۔ نازک جذبات اور دقتیں فلسفیانہ خیالات سے جو اکثر فارسی شاعروں کے قدیم رنگ میں لیکن بالکل پہلی مرتبہ بیان کئے گئے ہیں، ہمارے فہم و ادراک پر بہت بار ڈالتے ہیں اور اس سے زیادہ ہماری ہمدردی پر ذیل میں شاعر کے ایک مسلمان دوست (جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب ذوق ہے) کے

خط سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے جو شاعر کو لکھا گیا تھا۔ یہ اقتباس اقبال کی شاعری پر گہری روشنی ڈالتا ہے۔

"آپ اپنے ناظر کو خیال کی جس بلندی پر آسانی سے لیجانا چاہتے ہیں اس شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ بہت وسیع ہو۔ غور و فکر کی عادت بہت بڑھی ہوئی ہو او وہ دنیا پر بہت شک و شبہ کی نظر ڈالتا رہا ہو آپ کا کلام صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن کو ایسے جادو سے مسحور ہو جانے کی عادت ہو یا ایسے لوگوں کے لیے جو ایک دام سے دوسرے دام میں پھنستے رہنے کے متلاشی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انسانی جذبات کے سارے عالم کی خاک چھانی ہے جس میں اعلیٰ ترین وجدانی کیفیات اور تاریک ترین شکوک سبھی شامل ہیں آپ کے کلام کے بارے میں یہ مصرع بالکل سچ ہے •••

"رست از یک بند تا افتاد در بند و گر"

ہم جیسے لوگ جنھوں نے نہ اتنا محسوس کیا اور نہ اتنا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے اس لائق نہیں ہیں کہ اس اعلیٰ روحانی دنیا میں رہیں یا رہنے کی کوشش کریں تاہم کبھی کبھی ہم اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔"

میں یہاں صرف اتنی کوشش کر سکتا ہوں کہ شاعر کے خیالات کی جھلک دکھلادوں اور وہ بھی اس امید میں کہ شاید میرے ترجموں کو پڑھنے کے بعد کسی کو شاعر کے اس شاندار کلام کا پورا مطالعہ کرنے کی ترغیب ہو۔ اقبال کی اعلیٰ اور پرزور شاعری اس قابل ہے کہ اس سے واقفیت پیدا کی جائے۔ مانا کہ اس کلام کے پڑھنے سمجھنے اور لطف اندوز ہونے میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہے لیکن ان مشکلات کے جھیلنے کے بعد صلہ بھی کافی مل جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک خود شعوری اور انفرادیت ہی سب کچھ ہے وہ اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ خود شناسی خود استقلالی اور ترقی ذاتی کا وعظ کہیں زندگی کا مغز "عمل" ہے زندگی کی تکمیل روحانی او اخلاقی قوت میں ہے جو اطاعت اور تسلیم سے ترقی پاتی ہے۔ مادہ پر فتح پانے سے، ہم آزاد ہو جاتے ہیں سرگرم زندگی اور وقت کے مکانی تصور کو نظر انداز کر دینے سے، ہم بقاء کو حاصل کر سکتے ہیں۔

گدائے جلوہ رفتی برسر طور
کہ جان تو زخود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاش آدمے بست

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدر یا غلط و باموجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

جہان ما کہ پایانے ندارد
چوماہی دریم ایام غرق است
یکے بردل نظر وا کن کہ بینی
یم ایام دریک جام غرق است

اے برادر من ترا از زندگی دام دم نشاں
خواب رامرگ سبک داں مرگ راخواب گراں

می خورد برذرہ مایچ و تاب
محشر سے در ہر دم ما مضمر است
باسکندر خضر در ظلمات گفت
مرگ مشکل زندگی مشکل تر است

حیات جاوید

ملاحظہ ہو نظم حیات جاوید (پیام مشرق)

ملاحظہ ہو نظم زندگی پیام مشرق

زندگی و عمل

ملاحظہ ہو نظم زندگی و عمل (پیام مشرق)

ملاحظہ ہو نظم نوائے وقت (پیام مشرق)

ملاحظہ ہو نظم سرد وانجم۔ (پیام مشرق)

پیام مشرق کے آخری حصہ کا مقصد جس کا عنوان نقش فرنگ ہے یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مشرق کے رہنے والے کو یوروپی خیال کے چند اہم پہلوؤں کی ایک جھلک دکھادی جائے جیسی کہ شاعر نے خود اپنی آنکھ سے دیکھی ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ ہم اپنے آپ کو ویسا ہی دیکھیں جیسا کہ دوسرے لوگ ہمیں دیکھتے ہیں اور یہ بات اس سے بھی بہتر ہوگی اگر ہم اس اعلیٰ

پیغام کو اپنے دلوں میں جگہ دیں جس میں اقبال ہمیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ ہم خشک عقلیت کی بیڑیوں کو توڑ کر زندگی اور محبت کی اندرونی دنیا میں داخل ہوں۔

دانش اندوختہ دل زکف انداختہ
آہ زاں نقد گراں مایہ کہ در باختہ
دشت و کہسار نوردید و غزالے نہ گرفت
طوف گلشن زد و یک گل بہ گریبانش نیست
(پیام مشرق صفحہ ۲۲۶)

چارہ اینست کہ از عشق کشادے طلبیم ... پیام مشرق ۲۲۶ تا ۲۳۱

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیر جہان دگر است

زندگی جوئے روانست و رواں خواہد بود
شمع گشتند و ز خورشید نشانم دادند
(پیام مشرق ۲۳۲ - ۲۳۳)

اقبال سیاسیات میں کسی آسان راستہ کے قائل نہیں مجلس اقوام کے متعلق ان کی نظم ان کی اس خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ملاحظہ ہو قطعہ جمعیت الاقوام

ملاحظہ ہو قطعہ فلسفہ و سیاست

لیکن فلاسفر کو بھی اقبال نے چند تلخ نکتے کھانے پڑتے ہیں ان میں خاص طور پر ہیگل قابل ذکر ہے۔ جس کی فلک پرواز عقل کو۔

ماکیاں کز زور مستی خایہ گیرد بے خروس

کہا گیا ہے مسلم ناظرین کے سامنے یورپین فلاسفی کو پیش کرنے کا طریقہ جو مصنف نے اختیار کیا ہے اس کو دکھانے کے لیے میں ان اشعار کو پیش کرتا ہوں جو شوپن ہار اور نطشا کے عنوان سے لکھے گئے ہیں

ملاحظہ ہو شوپنہار و نطشا (پیام مشرق ۲۰۴)

میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں مصنف پیام مشرق کو مسلمان وائٹلسٹ (Vitalist) کہوں تو بے جانہ ہوگا اور یہ واقعہ ہے کہ وہ جدید فلاسفہ میں جتنی زیادہ ہمدردی برگساں سے رکھتے ہیں اتنی

کسی اور فلسفی سے نہیں رکھتے ۔ برگساں کی تعلیم کو انھوں نے ان اشعار میں پیش کیا ہے ۔

ملاحظہ ہو نظم پیغام برگساں ۔۔ (پیام مشرق)

ظریفانہ اور تیز تنقید کے خواشمندوں کے لیے پیام مشرق میں بہت کچھ دلچسپی کا سامان موجود ہے مثلاً آئنسٹائن کے متعلق لکھا ہے کہ " روشنی کا مظہر جس نے موسیٰ اور ہارون کی نسل سے زردشتی مذہب کو زندہ کیا" ۔ یا لینن قیصر ولیم سے اشتراکیت کی فتح کا ذکر کرتا ہے جس کا جواب قیصر یہ دنیا ہے کہ لوگوں نے ایک مالک کی جگہ دوسرا مالک بدل لیا ۔

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

محاورہ مابین حکیم فرنسوی آگئس کومٹ و مرد مزدور (۲۴۴) قسمت نائہ سرمایہ دار و مزدور (۲۵۵) اور نوائے مزدور (۲۵۷) یہ تینوں نظمیں یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ اقبال کلیتہ مزدور طبقہ کے طرفدار ہیں نوائے مزدور ملاحظہ ہوں (پیام مشرق)

یہ کہا جاتا ہے کہ " فلسفہ خیالات کی جس رو کو عقلیت کی مخالفت میں جاری کرتا ہے وہی سیاسی دنیا میں سلطنت کی مخالفت میں جاری ہو جاتی ہے ۔ انتہا پسند قوم پرست اور اتحاد اسلام کے حامی اقبال کے کلام کو اپنی تائید میں نقل کرینگے بالکل اسی طرح جس طرح سنڈیکلسٹ افراد برگساں کو نقل کرتے ہیں لیکن زندگی کی ابداعی حرکت کا غیر عقلی ہیج پر قائم ہونا ضروری نہیں ہے ۔ اقبال نے صاف طور پر کہا ہے کہ ضبط نفس خود شعوری کی اعلیٰ ترین شکل ہے اور یہ کہ تصوری انسان میں عقل اور جبلت ایک ہو جاتے ہیں ۔ یہ یقین ہے کہ اس سے ان کے نقادوں کو تشفی نہیں ہوگی کیونکہ وہ صاف طور پر اس بات کو دیکھینگے کہ اقبال کے اصول کا کیا استعمال ہوتا ہے ۔ اقبال کا اعتذار بھی ملاحظہ ہو ۔

ملاحظہ ہو نظم خطاب بہ انگلستان (پیام مشرق ۲۹۴)

تبصرہ نگار: اے نکلسن مترجم: حبیب اللہ رشدی

عبدالقادر سروری

اقبال

آزاد حالی اور اسمعیل کے عمل اور اکبر کی مخالفت کے اثرات ابھی نمایاں بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سیالکوٹ کا یہ نوجوان شاعر اٹھتا ہے اور اپنے ذوق کی دستیاری سے نغمہ سنجی شروع کرتا ہے۔ پہلے تو وہ ماحول سے متاثر ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذاتی تجربہ اس کو ایسی لے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو اس کے ہم صفیروں میں سب سے زیادہ اہتزاز پیدا کرنے والا ہے۔

شاعر کے ذاتی حالات کا اس کے کلام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اقبال کا خاندان کشمیر کا ایک قدیم اور معزز خاندان ہے۔ ان کے اجداد دینی علوم سے خاصا شغف رکھتے تھے جس کا گہرا اثر کلام سے نمایاں ہے۔ اقبال خود سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد آکر رہ گئے تھے ولادت ۱۸۷۵ء (اب یہ امر طے شدہ ہے کہ اقبال ۹۔ نومبر ۱۹۷۷ء کو پیدا ہوئے) میں ہوئی۔ سیالکوٹ ہی میں ابتدائی عمر کا زمانہ بسر ہوا اور بعد کو ڈگری کی تعلیم کے لیے لاہور چلے آئے۔ کشمیر کی دل فریبی سے ایک عالم متاثر ہے۔ اقبال جیسے شاعر کے دل سے اس شعریت سے پر خطۂ زمین کی یاد کہاں نکل سکتی تھی بچپن کے اکثر قطعات میں کشمیر کو یاد کیا ہے۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپزیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کیا عجب ہے کہ ذیل کے اشعار میں بھی یہی احساس کام کر رہا ہو۔

کیا بر نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں چمن میں میں قید میں پڑا ہوں
پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

اقبال کی خاندانی خصوصیات کی طرح ان کی تعلیم کی روش نے بھی ان کی طبعیت کو بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے وہ سیالکوٹ کے ایک قدیم مکتب میں بٹھائے گئے۔ آئندہ فدائی مشرق کے دل میں مشرقی فنون سے عشق کی یہ تخم کاری تھی۔ یہاں اقبال نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں کہ ضرورت زمانہ نے انہیں مکتب چھوڑ کر انگریزی مدرسہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا۔

عموماً یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا کی تمام بڑی ہستیاں اپنی ابتدائی تعلیم میں یا تعلیم کے کسی خاص مرحلہ پر بھی اپنے ہم جماعتوں سے ممتاز رہی ہوں۔ اور اسی طرح ہر ممتاز طالب علم زندگی کی کش مکش میں کامیاب رہے۔ تاہم اقبال ان ہستیوں میں سے ہیں جو ہر جگہ اور ہمیشہ بلندی کے ممتاز معیار پر رہتی ہیں۔ امتیاز کے ساتھ انھوں نے ابتدائی و سطانی اور فوقانی تعلیم ختم کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکاچ مشن کالج میں شریک ہونے کے ساتھ ہی انہیں پبلک مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی۔ وقوع امر سے پہلے اس کے اسباب فطرت کی طرف سے فراہم ہو جاتے ہیں۔ اس کالج میں اقبال جیسے ذہین طالب علم کو ایک جید عالم کا سہارا مل گیا۔ یہ مولوی سید میر حسن ہیں جو بعد میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے مولوی صاحب عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے۔ ان کے شخصی اثر کے متعلق آنریبل سر شیخ عبد القادر لکھتے ہیں۔ "ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے اس کی طبعیت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں"۔ عربی اور فارسی سے مناسبت طبعی اقبال کو خاندانی ترکہ میں ملی تطفی اس پر میر حسن سے عالم کا ساتھ گویا پیاسے اور سمندر کی یکجائی۔

اقبال کا ذوق سلیم اور عربی اور فارسی زبانوں کا صحیح مذاق اسی تعلق کا نتیجہ ہے اس کی دستیاری سے وہ آئندہ اردو سے زیادہ فارسی شاعری میں کامیابی حاصل کر سکے اور اردو میں نئے فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کے ادا کرنے کے لیے سانچے فراہم کر دیئے۔ ان کی لفظ تراشی میں جس قدر گہرائی ہے اس سے زیادہ ادبیت بھی موجود ہے۔ فارسی شاعری میں اقبال کے کارنامے لازوال ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس آخری دور میں جس طرح اقبال اردو کے بے مثل شاعر ہیں فارسی میں بھی ان کا ہندوستان میں کوئی مدمقابل نہیں۔ ایران میں تو اب بڑے شاعروں کا پیدا ہونا گویا مسدود ہی ہو گیا۔

اسکاچ مشن کالج سے اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا نہ صرف عربی بلکہ انگریزی میں ان کی ممتاز کامیابی نے انہیں وظیفے اور تمغے دلائے۔ یہیں اقبال کی شاعری کی مقبولیت کی بھی ابتداء ہوئی۔ شاعر کی حیثیت سے اقبال ان لوگوں میں ہیں جن کی طبعیتیں ابتداء ہی سے بار آور ہوتی ہیں۔

لیکن اقبال کی آئندہ عظمت کا بنیادی پتھر لاہور ہی میں رکھا گیا۔ جہاں بی اے کی تعلیم کے

لیے آگئے تھے ۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اقبال فلسفہ اپنا اختیاری مضمون لیکر داخل ہوئے ۔ گزشتہ لسانی تکمیل کے مرحلہ سے گذرنے کے بعد یہاں فن فلسفہ میں بھی ایک ایسا شفیق استاد مل گیا جس کو خود مشرق اور خصوصاً اسلام سے خاص انس تھا ۔ یہ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر آرنلڈ ہیں جو بعد میں سرآرنلڈ ہوگئے تھے ۔ ان کی شخصیت سے سریخ عبد القادر بھی بے حد متاثر ہیں اور لکھتے ہیں "پہلے انھوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانہ میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کو پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی" اس دوسرے موقع پر بھی پروفیسر موصوف نے اقبال جیسے شاعر کے خیالات کو سنوارنے میں سعی مشکور کی اور اس طرح اردو کے دو بڑے ادیب ان سے متاثر ہوئے ۔

جس طرح اقبال نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے پروفیسر آرنلڈ کے دل میں جگہ پیدا کرلی تھی اسی طرح آرنلڈ کی اعلیٰ قابلیت نے بھی اقبال پر احترام اور محبت کے لازوال اثرات چھوڑے ان باہمی تاثرات کی ناقابل فراموش یادگار "نالہ فراق" کے زبردست جذبات ہیں ۔ انہیں کی محبت میں دراصل اقبال کا فلسفیانہ کردار بنا اور نشوونما پایا ۔ یہی وہ تعلق ہے جس نے اردو کو ایک غور و فکر کرنے والا شاعر عطا کیا ۔

یوں تو اسکاچ مشن کالج ہی سے اقبال کی شاعری شروع ہو چکی تھی لیکن لاہور میں آکر وہ خوب چمکی اس کے کئی اسباب ہیں، پہلے تو یہ کہ دہلی اور لکھنؤ کی کش مکش سے چھوٹنے کے بعد اردو ادب اور شاعری کو اب لاہور میں ٹھکانہ نصیب ہوا تھا ۔ اس زمانہ میں کلکتہ کے علاوہ علمی سرگرمی میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز تھا دوسرے دہلی اور لکھنو کے بعض بچے کچے شاعر بھی یہاں جمع ہوگئے تھے جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی، میر ناظر حسین ناظم لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان دونوں بزرگوں کے قیام نے لاہور کے بازار حکیماں میں ایک بارونق مشاعرے کی بنیاد ڈال دی تھی ۔ اقبال کا ذوق شاعری بھی ان کو کشاں کشاں اس محفل تک لے گیا ۔ ان کی قابلیت نے محفل مشاعرہ کے تمام اراکین کو ان کا مداح اور دوست بنادیا اور خود اقبال کو یہ فائدہ ہوا کہ انہیں مرزا ارشد کے فیض محبت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا ۔ داغ دہلوی سے مشورہ کرنے سے پہلے اقبال نے ارشد گورگانی سے بھی اصلاح لی ۔

ابھی دہلی کے آخری شاعر مرزا خان داغ دہلوی زندہ تھے ۔ ان کی غزل خوانی کے انوکھے انداز نے انہیں نہ صرف اردو کے تمام پچھلے شاعروں سے ممتاز بنادیا تھا بلکہ اپنے معاصرین میں استادی کا درجہ بھی عطا کردیا تھا ۔ گو یہ ملازمت کے سلسلہ میں دکن آگئے تھے لیکن ان کا فیض ہندوستان بھر میں بواسطہ اور بلاواسطہ برابر جاری تھا ۔ اقبال ابتدائی غزل گوئی میں ان کے رنگ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مراسلت کے ذریعہ ان کی شاگردی اختیار کرلی ۔ اس واقعہ کا اثر صرف واقعہ کی حد تک نہیں ہے بلکہ اقبال کی ابتدائی غزلوں کو بنانے اور ان کی زبان کو درست کرنے

میں یہ بے حد کار گر ثابت ہوا۔ ابتدائی غزلوں کی زبان میں وہ مرزا داغ کی سلاست اور اسلوب میں اسی ندرت کو جگہ دینا چاہتے ہیں جس سے داغ کی شاعری ممتاز ہے ذیل کے انتخاب سے یہ امر بہ خوبی واضح ہو جائیگا۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
تمہیں وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندہ کی سرکار کیا تھی

اس طرح کی غزلیں اس میں شک نہیں اقبال کے پاس کم ہیں لیکن ان کے قصداً نظر انداز کر دیئے جانے کا سخت احتمال ہے۔ اقبال کی طبعیت بچپن سے سنجیدہ واقع ہوئی ہے۔ داغ کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہو گیا ہو گا کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر تکراری مضامین کے سواء ان کے پاس کیا تھا جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے۔ کتا یقین ہے کہ اقبال نے اس طرح کی غزلیں انتخاب کے وقت خود چھانٹ دیں۔

غزل کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کے سب سے زبردست تاثر کا انکشاف بھی ضروری ہے۔ داغ کی شاعری سے سیری حاصل ہو جانے کے بعد قطرتاً اقبال کی طبعیت کو غالب کے کلام سے لگاؤ پیدا ہو غالب کا کلام در حقیقت اقبال کے مطالعہ کے قابل تھا کیونکہ دونوں کی ذہنیت بڑی حد تک مشابہ ہے۔ غالب میں وہی عمق ہے جس کی اقبال کے دماغ کو ابتداء سے تلاش تھی۔ شاعر خصوصاً بڑھتا ہوا شاعر ہمیشہ مضطرب ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی بے چینی کو کہیں سکون مل سکتا ہے تو وہ صرف عمیق خیالات کی دنیا میں۔ اقبال کے متلاشی دماغ کو غالب کے کلام میں ایک ساتھی سامل گیا اس کے بعد انھوں نے جو غزلیں لکھیں وہ لفظاً اور معناً غالب کی تقلید نہیں تو غالب کے کلام سے متاثر ضرور ہیں۔ ذیل کے اقتباسات کو پڑھئے تو وہی انداز خیال وہی تیڑھی ترچھی چالیں وہی مشکل پسندی اور بعض وقت تو وہی صوری اور معنوی تقلید نظر آئے گی۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
حباب آسا سر موج نفس باندھا ہے محمل کو
ذرا دیکھ اے شرر ذوق فنا مجھ کو کہاں تک ہے

سکون دل سامان کشود کار وغیرہ کا جواب تلاش کیجیے تو سوائے غالب کے دیوان کے اور کہیں نہ ملیگا (اس کے مقابلہ میں غالب کی وہ غزل ہے جب تک وہاں زخم نہ پیدا کرے کوئی)

بہر حال اقبال نے ارشد سے صوری تلمند حاصل کیا، داغ سے تحریری صلاح لی مگر غالب سے معنوی استفادہ کیا اور یہ آخری اثر ان کی طبعیت کے مناسب تھا اس لیے وہ دیرپا ہے اور اب تک کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان شعراء کے اثرات کا اختلاف ایک اور طرح بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

اقبال نے داغ کے انتقال پر اظہار غم کیا۔

بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں
چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

ے سے بہتر مرزا خاں داغ کی شاعری کی تعریف نہیں ہو سکتی آخر میں اقبال کے جذبات محبت بھی پھوٹ پڑتے ہیں۔ مرزا غالب پر بھی ایک نظم لکھی ہے۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے ہر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

اس سے بڑھ کر کسی شاعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ شاعر کے دل پر غالب کا زبردست قبضہ اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات احترام پوری نظم میں ہر جگہ نمایاں ہیں یہی فرق غالب اور داغ کے اثرات کا ہے۔

قومی شاعری کا مضمون حالی نے بہت ہر دلعزیز بنادیا تھا اس کے باوجود اقبال اب تک اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اس طرف اقبال کی توجہ کا سبب بھی ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔

جب اقبال لاہور کے ادبی خصوصاً شاعروں کے حلقہ میں بازار حکیماں کے مشاعرے کی نظموں کی وجہ سے روشناس ہوگئے تو ان کے دوستوں نے انہیں اس خدمت پر بھی آمادہ کر دیا جو اس سے پہلے حالی شبعی نذیر احمد انجام دیتے رہے تھے۔ لاہور کی انجمن حمایت اسلام بڑا قدیم ادارہ ہے اس کے سالانہ جلسوں کی افتتاح بھی علیگڑھ کے یا اس سے متعلق چندوں کے جلسوں کی طرح

ایک قومی نظم سے عمل میں آتی تھی اقبال بھی دوستوں کے مجبور کرنے سے اس خدمت کو بجالانے آمادہ ہوگئے جو نظم پہلی دفعہ انھوں نے پڑھی وہ "نالہ یتیم" تھی گویہ اقبال کی پہلی نظموں میں سے ہے لیکن اس کے مقابلہ میں آزاد حالی شبلی اور نذیر احمد کی نظمیں نقش اولین معلوم ہوتی ہیں۔ جو تسلسل جو عمق اور جو نتیجہ ذائی اس نظم میں ہے وہ اگلی کسی نظم میں نہیں۔

یہ گویا اقبال کی "قومی نظم" نگاری کی ابتداء تھی اس کے بعد اور کئی قومی نظمیں جیسے "ابر گہربار، فریاد امت" وغیرہ انہیں سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔

اس زمانہ کا ایک اور اہم واقعہ اقبال کی سر شیخ عبد القادر سے ملاقات ہے جس کا ذکر شیخ صاحب نے دیباچہ بانگ درا میں کیا ہے۔ شیخ صاحب اس وقت اردو کے سب سے بہتر رسالہ "مخزن" کو مرتب کیا کرتے تھے اور اقبال سب سے اچھے شاعر بن رہے تھے۔ دونوں میں یگانگت کا پیدا نہ ہونا تعجب کا سبب ہوتا یہ ادبی دوستی انگلستان میں زیادہ مستحکم ہو گئی چنانچہ اقبال جب یورپ سے متاع علم لوٹ کر وطن واپس آنے لگے تو مال غنیمت سے اپنے وطن کی ذہنی تزئین میں شیخ صاحب کی مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔۔۔

اٹھ کر ظلمت ہوی پیدا افق پر خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
شمع کی طرح جنس بزم کہہ عالم میں
خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

اس میں اقبال کے اس انقلاب خیال کے جراثیم موجود ہیں جو قیام یورپ میں واقع ہوا اس کے علاوہ ان کی آئندہ شاعری کی عمارت کا نقشہ بھی موجود ہے، جس سے ہم آگے مفصل بحث کرینگے۔ شیخ صاحب کی کئی خدمات میں اردو کی ایک یہ خدمت بھی نہایت مہتم بالشان ہے کہ انھوں نے ایک بھٹکے ہوئے شاعر کو رستہ پر لگادیا۔ یورپ میں اقبال نے شاعری کو ترک کرنے کا جو ارادہ کر لیا تھا وہ شیخ صاحب کی حکمت عملی سے فسخ ہو گیا۔ اقبال کی شاعری کو سمجھانے میں بھی شیخ صاحب نے یہ احسان کیا کہ سب سے پہلے اس کے تین نمایاں دوروں کا پتہ لگایا۔ جس پر اکثر بعد کے تنقید نگاروں کے خیالات مبنی ہیں۔ اقبال کی بعض بہترین نظمیں جیسے "ہمالہ" "تصویر درد" وغیرہ شیخ صاحب کے رسالہ "مخزن" میں پہلے پہل شائع ہوئیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے اقبال نے بی۔ اے اور ایم اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے او۔ تھوڑے ہی عرصہ میں پہلے اورینٹیل کالج اور پھر اپنی قدیم درسگاہ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ اس وقت

تک اقبال کی شاعری مخصوص اداروں یا شاعروں کی غزل خوانی سے آزاد ہو گئی تھی ۔ اب نظموں کو پڑھ کر سنانے کا موقع باقی نہیں رہا تھا عوام ان کا استقبال کرنے کے لیے ہر جگہ تیار رہتے تھے اور یہ اخبارات اور رسائل کے ذریعہ ان تک پہنچ جاتیں ۔ شاعر کا مضمون مخصوص نہیں ہوتا اس کا دل مصوری کا آلہ ہوتا ہے جس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آجاتی ہے ۔ اس وقت ہندوستان کی غلام قوموں کے مابین اختلافات اور ان کی خیالی بنیادوں پر جان توڑ کش مکش نے ہر جگہ اودھم مچا رکھی تھی ۔ اقبال بھی ہر درد مند دل کی طرح اس حالت کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہوتے اور فریاد کرتے ہیں ۔ اسی سبب سے ان کی اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا جزو غالب ہے ۔ ہمالیہ صدائے درد تصویر درد نیا شوالہ ترانہ ہندی وغیرہ نے اقبال کو حالی اور اکبر کی صف میں نمایاں جگہ دلادی ۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے ۔ جاتے ہوئے بجائے دنیوی سفارشات فراہم کرنے کے وہ روحانی استعانت کے لیے حضرت محبوب الہیٰ کی درگاہ پر گئے مزار پر جو نظم پڑھی وہ کئی پہلو سے اہمیت رکھتی ہے پہلے تو اس سے شاعر کی طبعیت کا رجحان معلوم ہوتا ہے ۔ پھر جو التجا کی ہے گ وہ دنیوی طالبوں کی عزت و ثروت یا شہرت کی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ علمی معیار کا حصول ہے جو شاعر کا نصب العین تھا ۔

نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں میں ہو اس قدر آگے
کہ مجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

یوروپ میں اقبال نے اس نصیب العین کے حاصل کرنے کی سعی کی ۔ انہیں بو بچپن سے عربی فارسی ، اور جو فسلفہ کا شوق تھا ۔ تحقیقات بھی کی تو انہیں سے متعلق ڈاکٹری کے لیے ایران اور مابعد الطبعات پر مقالہ لکھا لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا باقی وقت ان کا مشرقی اور مغربی زبانوں کے شاہکاروں کے مطالعہ میں صرف ہوا ۔ جن میں فلسفہ کی حد تک شوپن ہار ، ہیگل ،

کانٹ برگساں لاک اور شاعری میں شکسپیر بائرن براؤننگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یورپ کے قیام میں اقبال کی ملاقات بعض ایسے علماء سے ہو گئی جن کی دنیا میں کافی شہرت ہے۔ یہ پروفیسر براون آنجہانی، ڈاکٹر نکلسن وغیرہ ہیں۔ ان میں بعض کی دوستی کو اقبال کی حیات کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ان کی شاعرانہ قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جب اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نظم "اسرار خودی" لکھی تو ڈاکٹر نکلسن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے تعلیقات کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ اس ترجمہ نے دراصل اقبال کو انگریزی اور دوسرے مغربی علماء کے وسیع تر حلقوں سے روشناس کیا۔ یورپ ہی میں اقبال کی فارسی شاعری کی ابتداء اور شہرت ہوئی۔ اس کی ابتداء کا واقعہ سر شیخ عبد القادر نے اپنے مقدمہ بانگ درا میں بیان کیا ہے (صحفہ ۹) پہلی ہی غزلیں لکھنے کے بعد اقبال کو معلوم ہوا کہ ان کی طبعیت فارسی شعر گوئی میں بھی ویسی ہی رواں ہے جیسی اردو میں تھی۔ یہ ایک انکشاف تھا جس سے اقبال نے بے حد فائدہ اٹھایا۔ ان کی بہترین شاعری فارسی میں ہے۔ اردو میں اس کے فطری حدود کے لحاظ سے ان کی شاعری ہندی اور ہندوستانی تھی لیکن فارسی شاعری کا مخاطب تمام عالمی اسلامی فارسی شاعری میں اس وسعت کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔

یورپ ہی کے قیام سے متعلق ایک اہم بات اور رہ گئی ہے یہاں رہ کر اقبال نے جس طرح علمی خزانوں کو ٹٹولا اسی طرح ذہنیتوں اور معاشرہ کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ جو انقلاب ان مشاہدات سے ان کے نقطہ نظر میں پیدا ہوا وہ ان کی فارسی سے کم مگر اردو شاعری میں بے حد نمایاں ہے۔ کیونکہ فارسی شاعری دراصل یورپ کے بعد شروع ہوئی۔ لیکن یورپ جانے سے پہلے کی اردو شاعری بعد کی شاعری کے لیے موازنہ کا کام دیتی ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے جانے کے بعد لندن یونیورسٹی میں عربی کے معلم مقرر ہوگئے تھے۔ اتفاق سے جن دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے، پروفیسر صاحب کو کسی مجبوری کی وجہ سے رخصت لینی پڑی تھی۔ ان کے غیاب میں اقبال ان کا کام انجام دیتے رہے۔ یہ ایک ہندوستانی کے لیے اس کی قابلیت کا قابل فخر اعتراف ہے۔

۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے وطن واپس ہوئے۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد گورنمنٹ کالج کی ملازمت ترک کر کے وکالت شروع کر دی۔ اقبال کی شاعری کا یہی بہترین اور پختہ کارانہ دور ہے۔ یہ دور شاعری کی کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے بے حد اہم اور درحقیقت پہلی شاعری کا منتہا ہے۔

ہم نے اوپر کہیں اس کا ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے سر شیخ عبد القادر نے اقبال کی شاعری کے تین دوروں کا پتہ لگایا۔ پہلا دور ابتدائی مشق سے لے کر ۱۹۰۵ء میں اقبال کے یورپ جانے تک ہے۔ دوسرا دور قیام یورپ کا اور تیسرا ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے

شاعر کے کلام اور اس کی ذہنیت کا ارتقاء معلوم کرنے کے لیے خاص خاص زمانوں میں شاعر کے میلانات کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ خصوصاً وہ شاعر جو اپنے عہد کی پیداوار ہو۔ اقبال کی شاعری میں ان تینوں زمانوں کا فرق اس قدر نمایاں ہے کہ وہ نقاد جو ان کی حیات ماحول اور ان کی طبعیت پر ان کے اثرات سے ناواقف ہوں شاید ان کی بعد کی یا پہلی نظموں کو ان کے نام سے منسوب کرنے میں پس و پیش کریں۔ بعض حالات میں ان کا نقطۂ نظر اس قدر بدل گیا ہے کہ پہلے سے متضاد معلوم ہوتا ہے۔

پچھلے صفحات میں اقبال کی حیات کے ان تمام پہلوؤں پر ہم نے کافی روشنی ڈالی ہے جن سے ان کی شاعری مختلف اوقات میں متاثر رہی ہے امید ہے کہ ان امور کی مدد سے ان کی شاعری کی اسپرٹ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

اگلے اور پچھلے تمام شاعروں کی طرح اقبال کو بھی نمود حاصل کرنے سے پہلے شاعر سازی کے کارخانے سے بھی گذرنا پڑا۔ متقدمین کی طرح اقبال کی ابتداء بھی غزل کی شاعری سے ہوئی۔ انہیں قدیم استادان فن کی شاگردی بھی کرنی پڑی جس کی تفصیلات پیچھے گذر چکی ہیں۔ اقبال نے قدیم شاعری کی مشق سے اتنا ہی فائدہ اٹھایا جتنا کسی پہلے اساتذہ سخن نے اٹھایا تھا۔ لاہور میں انہیں ارشد گورگانی سے بہتر شاعر نہیں مل سکتا تھا۔ اقبال نے ان سے تلمذ حاصل کیا پھر جب نظر اور وسیع ہوئی تو داغ جیسے استاد فن کو غزل دکھائی۔ اس طرز سے بھی سیری ہو گئی تو پھر وہ غالب کی شاعری سے استفادہ کرنے میں مصروف ہوگئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان تینوں اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد بھی اقبال نے ایک سچے شاعر اور متلاشئ حقیقت کی طرح دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مشاعروں کے کلام سے الہام حاصل کیا جو کچھ سیکھا تھا اس پر قانع ہونے کی بجائے انھوں نے اپنی ایج سے کام لیکر قدماء کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔ غزل کی شاعری میں جب یہ پختہ کار ہوگئے تو مغربی شعراء کے کلام سے بہترین خیالات اور بہترین اسالیب کو انھوں نے اپنا نمونہ بنایا۔ بڑھنے والی اقوام کے افراد کا یہی اصول رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی غزل کی شاعری کا بڑا حصہ ہماری نظر کے سامنے نہیں ہے اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ بھی صرف ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے غرض اس باقیات الصالحات کے متعلق جو بھی کہا جاسکے سب صحیح ہے لیکن اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ اس سے غزل کی صنف پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں داغ کی پیروی کی ہے معلوم ہوتا ہے داغ کی روح کو اپنے جسم میں داخل کر لیا ہے، وہی سادگی وہی شگفتگی اور وہی زبان کا چٹخارہ ہے جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے بعد میں جب غالب کے کلام نے ان پر تسلط جمایا تو یہ غالب ہی کے رنگ میں کہنے لگے تھے۔ اگر یہی مشق سخن جاری رہتی تو ہمیں توقع ہے کہ اردو میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو جاتا۔ داغ کی شاعری سے زبان کی ادائی اور سلاست سیکھنے کے بعد غالب کی

سنگین فکر کے تبتع نے انہیں ایک مکمل غزل گو شاعر بنادیا تھا۔ یہ ابتدائی مرحلے آئندہ شاعری کا پیش خیمہ ہیں۔

اساتذہ فن کی شاگردی سے نکل کر شاعر نے جب اپنے اطراف نظر ڈالی تو اس کے سامنے آزاد، حالی، شبلی اور اسمعیل کی شاعری کے نمونے موجود تھے۔ اقبال کے پاس ان کا مطالعہ یہ معنی تو رکھ نہیں سکتا تھا کہ آنکھ بند کر کے اس روش پر گام زنی شروع کر دی جائے ان کے مطالعہ کے ساتھ ہی ان کے خیالات اور مطمع نظر کی طرف توجہ کا منعطف ہونا ضروری تھا۔ فطرتاً اقبال بھی حالی اور اکبر کی قومی اور معاشرتی فضاء میں چلنے پھرنے لگے۔ ہر نو عمر انگریزی خواں کی طرح وطن اور قوم کی محبت کے جذبات ان کے دل میں ابھی بھرنے لگے ہندوستانیوں کی جو حرکت ان کو ناگوار معلوم ہوتی وہ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ عوام کے افعال میں مستقبل کا خیال بہت کم رہتا ہے حالی کی طرح قوم کی غلطیوں سے اقبال بھی اسے مطلع کر دیتے تھے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ منافشات پر ان کا جی جلتا تھا۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
لذت قرب حقیقی پڑمٹا جاتا ہوں میں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

وطنی نظمیں اقبال کی اس قدر مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھی ہوئی تھیں خصوصاً وہ نظم جس کا عنوان "ہندوستان ہمارا" ہے "صدائے درد" "ہمالہ" "تصویر درد" وغیرہ میں بھی وطنیت کا احساس شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

ان نظموں کے علاوہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعراء جیسے ٹینی سن۔ ایمرسن گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے یہ درحقیقت اقبال کی موضوعاتی نظموں کا اولین نقش ہیں۔ اس دور کے اکثر شعراء جنہوں نے مغربی نظموں کے مقابلہ میں نظمیں لکھنے کی کوشش کی وہ پہلے پہل مغربی شعراء کے کلام کو نمونہ بناتے رہے ہیں ماخوذ خیالات میں اقبال نے عموماً ایسی فلسفیانہ نظمیں انتخاب کیں جو اردو میں آنے کے بعد اس کا ایک جزو معلوم ہونے لگی ہیں یہ تقلید کی بڑی کامیابی ہے ایسی نظمیں اقبال نے عموماً بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ لیکن وہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔

فطرت کی عکاسی اور قلبی جذبات کے اظہار کے حقیقی اسالیب اردو میں میر حسن میر انیس اور نظیر اکبر آبادی کے زمانہ سے پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے ان شعراء کے کلام کو حالی سے پہلے بہت کم اہمیت دی گئی۔ آزاد اور حالی نے جب شاعری کا رخ بدل دیا تو فطرت نگاری کی اہمیت خواص و عوام پر روشن ہوئی۔ اسمٰعیل میرٹھی نے اردو شاعری کے اس خاص پہلو کو حد کمال تک پہنچادیا۔ اقبال کی شاعری جب شروع ہوئی تو لوگوں کی توجہ قدیم طرز کی شاعری سے ہٹ کر اسی طرح کی فطری شاعری پر جم گئی تھی گو تنوع کے نہ ہونے سے یہ میدان اس وقت تک صرف حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری پر محدود تھا لیکن اقبال کی فطری نظموں نے نہ صرف اس میدان کو وسیع کیا بلکہ آئندہ شعراء کے لیے بے شمار راستے کھول دیئے۔ "ہمالہ" "گل رنگیں" "ابر کہسار" "آفتاب صبح" "پیام صبح" "چاند" "صبح کا ستارہ" وغیرہ اقبال کی منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح جذبات کا صحیح مگر شاعرانہ اظہار جس طرح "مرزا غالب" "داغ" "تصویر درد" "کنار راوی" میں کیا گیا ہے ان سے پہلے کی اردو نظموں میں شاید ہی مل سکے۔ خود حالی کی نظمیں اس حیثیت سے بہت معمولی ہیں۔ اسمٰعیل کی منظر نگاری میں اقبال سے زیادہ گھلاوٹ اور سلاست ہے گو ان میں اقبال کی سی گہرائی نہیں ہے۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابتدائی نظموں میں اقبال کا شخصی عنصر اور ذاتی خیالات کی جھلک بھی بے حد موثر ہے فکر کی عمیق کے آثار اقبال کی چھوٹی سے چھوٹی اور سطحی سے سطحی نظم میں صاف ظاہر ہیں اقبال نہ صرف فلسفہ کے متعلم ہیں بلکہ اچھے مفکر بھی ہیں۔

اقبال کے اسلوب اور اکبر الہ آبادی کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہے یہ ہنسوڑ ہیں وہ مقطع لیکن اقبال کے کلام میں چند ظریفانہ نظمیں بھی ہیں۔ ان کے ماخذ کی تلاش کے لیے اکبر کے کلام کے اثر کی طرف رہنمائی بے جا نہ ہوگی۔ کوئی وجہ نہیں کہ نو عمر اقبال اکبر کے مقبول طرز شاعری سے کورے رہے ہوں۔ ذیل کے اقتباس کو کون اکبر کے اثر سے محفوظ خیال کر سکتا ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈی فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفع مرض کے واسطے پل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض

دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے مالسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

اکبر کا یہ اثر اقبال پر بہت ہی نام نہاد ہے اصلی اثر وہ ہے جس سے ان کی شاعری کی اصولی تعمیر میں مدد ملی اردو شاعری کے ارتقاء کا یہ وہ رشتہ ہے جو میر حسن سے شروع ہو کر انیس، نظیر، آزاد، حالی اور اسمٰعیل سے گذرتا ہوا اقبال تک پہنچ رہا ہے۔ حالی اپنی بنیادی کوششوں میں جن شعراء کا خواب دیکھ رہے تھے وہ در حقیقت اقبال ہی جیسے سخن آرا ہیں۔

شاعری کا ایک پہلو تربیتی بھی ہوتا ہے۔ شاعروں کے خیالات اقوام کی درستی میں بڑا حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس حیثیت سے قدیم اردو شاعری بہت کم اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ قوم کی کسی حالت سے تعرض نہیں کرتی۔ بعض شعراء کے کلام میں اخلاقی نکتے ملتے ہیں لیکن یہ زیادہ تر تصوف کے ضمن میں ظاہر ہوئے ہیں اور اس قسم کے اشعار اسقدر تھوڑے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہے۔

گو آزاد جدید شاعری کے سب سے پہلے علم بردار ہیں لیکن ان کی نظمیں قومی حالت سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے، انہیں حالی کے مقابلہ میں عقبی زمین میں ڈال رہی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تاریخ ادب کے سوا شاعر کی حیثیت سے آزاد کا ذکر آئندہ نسلوں میں بالکل نہ ہو اس کے بر خلاف حالی کی شاعری باوجود سیدھی سادی ہونے کے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگی۔ وہ قوم کی زندگی سے وابستہ ہو گئی ہے۔

اس نے نہ صرف شاعری کے بنیادی خیال میں ایک انقلاب برپا کیا بلکہ موجودہ تعلیم اور معاشرت کے بہت سے مسائل سے وہ واصل ہے اور قوم کے اخلاق خیالات کردار کو درست کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ قوم کو بیدار کرتی ہے اور اس کے سامنے ایک نصب العین بھی قائم کرتی ہے یا جیسے بعض وقت کیا گیا ہے حالی کی شاعری کا ایک حسین "پیغام" ہے۔

چلو تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو

گویا حالی ایک جدید قوم کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ اسمٰعیل کی شاعری فروعات میں حالی سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کی اصلی اسپرٹ وہی ہے جو حالی کی شاعری کی ہے بلکہ ایک جز یعنی فطرت نگاری میں وہ حالی سے مشترک بھی ہے۔

اکبر قدامت پرست طبیعت کے انسان تھے۔ اس لیے حالی کی جدید تعمیر سے وہ پوری ہمدردی نہیں رکھ سکتے وہ قوم کو غفلت سے بیدار تو کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو مغربی تقلید کے نمار میں اندھے کی طرح گرتے ہوئے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھ کر ترقی کی راہیں اختیار کریں زمانے کی ہر آن

تبدیلی کے ساتھ اپنی حالت کو بدلنا انہیں پسند نہیں تھا۔

ہوس پرستوں کو رکھوں یہ کد ہے
ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے
بدلنے ہی کو بدل رہا ہے

قومی اور وطنی جذبات سے لبریز دل اقبال جب اس اختلاف پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں قوم کی زبوں حالت پر حالی کے ساتھ ماتم کرنا پڑتا ہے ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال کے پاس یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے لیکن مرض کے علاج کا ان کے پاس کوئی معین نسخہ نہیں ہے اس لحاظ سے اس دور کی شاعری کے متعلق ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے اور اپنے ہم قوموں کے لیے کیا راستہ تجویز کرتے ہیں۔ اسی واسطے اس دور کی شاعری کو بعض بزرگوں نے تذبذب تلاش اور اضطراب کی شاعری بھی کہا ہے اقبال کی طبعیت کا یہ انتشار نہ صرف قومی نظموں سے ظاہر ہے بلکہ دوسری نظمیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ "شمع" "خفتگان خاک سے استفسار" "شمع اور پروانہ" وغیرہ میں یہ خصوصیت صاف ظاہر ہے۔ در حقیقت جو شاعر دنیا کی ہر چیز کی ماہیت دریافت کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی فطرت کے راز اس کی سمجھ سے بالا معلوم ہوتے ہیں آخرش وہ پریشان ہو کر کہنے لگتا ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا یوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہے

پھر وہ خدا سے وہ کرتا ہے کہ یہ رازہائے فطرت جو اس کے لیے معمہ ہیں اس پر منکشف ہو جائیں۔

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمہ کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

بعد کے دور کی نظموں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو عشق کی تلاش تھی جس کے بغیر زندگی بے لطف ہو رہی تھی تنہائی میں اور مجمع میں غرض ہر جگہ وہ اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی نصب العین ابھی تک معین نہیں ہوا جس کے لیے وہ بے چین ہے۔

یہ انتشار یورپ جانے کے بعد رفع ہو جاتا ہے اور شاعر وہیں سے آئندہ کے لیے ایک تجویز سوچ کر وطن واپس آتا ہے۔

غرض اس دور میں اقبال مجموعی حیثیت سے وطن پرست شاعر رہے۔ قومی نظموں سے ہٹ کر انھوں نے جو نظمیں اس دور میں لکھیں وہ بھی بلند پایہ ہیں۔ ان کا آئندہ اعلیٰ فلسفیانہ اور

صوفیانہ کردار ان نظموں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ "گل رنگیں" "خفتگان خاک سے استفسار" "شمع" "ماہ نو" "انسان اور بزم قدرت" "بچہ اور شمع" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے کائنات کے مہتم بالشان مسائل جیسے حیات حیات کے ماخذ حیات کا مقصد انجام حیات اور حیات بعد الموت اور عشق اور حسن وغیرہ سے بحث کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ تک پہنچنے کی وہ کوشش کرتے ہیں کہیں تو وہ اس عالم صغیر یعنی انسان اور اس کی قوتوں پر غور کرتے ہیں۔ کہیں وہ انسان اور بیرونی کائنات کو بالمقابل رکھ کر دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انہیں انسان کی ہنگامہ آرائی اور نیچر کی خاموش کارگزاری میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ جس چیز کی ماہیت کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ جاتے ہیں اس کے لیے خدا سے استعانت طلب کرتے ہیں۔

یہ دور "التجائے مسافر" پر ختم ہو جاتا ہے جس نظم میں شاعر نے اپنے اعلیٰ نصب العین کے حصول میں استقلال کی اس درگاہ سے دعا مانگی ہے۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور قیام یورپ کا ہے۔ یورپ میں اقبال کا زمانہ بہت مصروف گذرا ایک طرف تو علمی سرمایہ کو سمیٹ رہے تھے دوسری طرف یورپ کی معاشرت تمدن اور سیاست پر بھی ان کی نظر جمی ہوئی تھی ان کا مضمون چونکہ اسلامی فلسفہ خاص کر ایرانی فلسفہ تھا اس لیے ان کی طبعیت جس کو پہلے سے عربی اور فارسی سے خاص لگاؤ تھا اس مضمون میں خوب مثمر۔

یورپ میں اقبال کی شاعری کا جو زاویہ نظر بدلا اس کے بے شمار قدرتی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ فطری لگاؤ کی وجہ سے مقالہ کے لیے جو موضوع اختیار کیا وہ ان کو اسلامی فلسفہ سے بخوبی روشناس کروانے والا تھا دوسری اتفاقی بات یہ ہے کہ اقبال کو اپنی فارسی زبان پر قدرت کا انکشاف یہیں ہوا۔ تیسرے انھوں نے یورپ کی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر اس سے پہلے ان کے خیالات یورپ کو اپنا نمونہ بنانے کے تھے تو وہ بدل گئے چوتھی چیز یہ ہے پہلے وہ صرف ہندوستانی اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے شاعر تھے ہندوستان سے باہر نکل کر انھوں نے جب تمام عالم اسلامی پر ایک عام مصیبت کو مسلط دیکھا تو ان کی ہمدردی وسیع تر ہو گئی۔

اسلامی فلسفہ کی تحقیق نے اقبال کو حقیقی اسلام اس کے سادہ ترین اور مہتم بالشان زندگی، اس کے مطمح نظر اور اگلے مسلمانوں کی عظمت سے کماحقہ روشناس کر دیا۔ اگلی عظمت کے مقابلہ میں موجودہ مصیبت کو دیکھ کر ان کے ہمدردانہ جذبات میں تحریک پیدا ہوئی اور انہیں یہیں سے آئندہ نظموں کا موضوع مل گیا۔ پہلے اقبال کا یہ خیال تھا کہ مسلمان وطن پرست بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اب یہ خیال کمزور پڑ گیا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ ہندوستانیوں میں جو خیالی

تفریق پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہوتی ہی نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا۔ بچا کے دامن بتوں کے اپنا غبار راہ مجاز ہو جا۔ اس بے سود کام پر اپنی ہمت ضائع کرنے کو انھوں نے فضول سمجھا۔ اس کی بجائے بالواسطہ طریقوں سے مسلمانوں میں رواداری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ کیونکہ نصیحت براہ راست، ہمیشہ زبوں گوش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس تبدیلی خیال میں یہ حکمت بھی مضمر تھی کہ جب تک قومیں کسی اعلیٰ نصب العین کے حصول میں سرگرم نہ ہوں وہ اختلافات کے خیالات ہی کو اپنا میدان عمل سمجھتی رہتی ہیں۔

اب دقت یہ تھی کہ اردو جو ہندوستان کی زبان ہے صرف ہندوستان ہی تک محدود ہے بیرونی مسلمانوں تک اس کی رسائی ناممکن ہے اس کا حل انہیں اتفاقاً ہاتھ آگیا تھا۔ فارسی میں بھی یہ آسانی سے شعر لکھنے لگے تھے اس لیے انھوں نے فارسی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنالیا تاکہ مسلمانوں کا زیادہ وسیع حصہ اس کو پڑھ سکے۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد زیادہ توجہ اقبال نے فارسی شاعری پر صرف کی گو اردو میں بھی وہ برابر لکھتے رہے۔

یورپ کی سیاسی اور معاشرتی حالت کے مشاہدے اور مطالعہ نے اقبال کو ان کی خامیوں سے واقف کیا یورپ کی سیاست جس قدر پیچیدہ ہے اس سے زیادہ سقیم بھی ہے پیچیدگی یہ ہے کہ ان اقوام کا جو اصول ہے اس پر ان کا عمل نہیں اور جب اصول اور عمل دونوں موجود ہوں تو ان میں صداقت نہیں۔ یورپی قومیں آزاد اپنے آپ کو اسی وقت سمجھتی ہیں جب کہ ان کا کوئی غلام ہو اور وہ کسی قوم کی عزت اسی وقت کرتی ہیں جب وہ اس سے ڈریں ان کی سیاست کی بنیاد اس پر ہے کہ جس قدر ممکن ہو مادی اور سائنس کے وسائل سے دنیا کی دوسری قوموں کو تباہ اور برباد کر دیا جائے تاکہ ان کا بول بالا ہو۔ معاشرتی حالت میں جو اسقام ہیں ان کا تفصیلی ذکر ایک کتاب چاہتا ہے۔ سرمایہ والے اپنے ہی ہم جنس اور ہم قوم غریبوں اور مزدوروں کا خون چوسنے کے لیے بے چین ہیں۔ ادنی طبقے زندگی کی کم سے کم ضروریات کے لیے بھی دوامی کش مکش میں مبتلا ہیں مگر امراء کو اپنے عیش و آرائش سے سیری ہی نہیں ہوتی۔ پھر ان اقوام میں ظاہر پرستیاں ایسی ہیں کہ جن کی زندگی کے لیے قطعاً ضرورت نہیں ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ اپنے سائنس اور دوسرے مادی وسائل کی مدد سے دنیا کی خدمت کے بہانے تباہ کر رہا ہے۔

جب اقبال دنیا کی راہ نما قوموں کی حالت سے مایوس ہو گئے تو انہیں مجبوراً صدر اسلام کی زندگی کی طرف رجوع کرنا پڑا اسلام کے وسیع اصول مساوات، حریت و اخوت اور ان پر سختی کے ساتھ عمل پیدا ہونے ہی میں اقبال کو نجات نظر آنے لگی اسلام ہی کا نظام معاشرت ان کے لیے اب دار الامان باقی رہ گیا تھا کیونکہ بنی نوع انسان کی فلاح کا خیال پختہ ہو گیا۔ اب وہ تمام عالم میں کسی کو اپنا اور غیر ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کا دار الامان سب کے لیے تھا گویا عشق کی چنگاری جو ان کے دل میں فروزاں ہوئی تھی بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اب وہ تذبذب جاتا رہا اور متلاشی حقیقت کو

حقیقت سے پتہ لگ گیا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا
بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہہ سحر میں وہ
چشم نظارہ میں نہ تو سرمہ امتیاز دے

یہ خیالات در حقیقت الہام ربانی سے کم نہیں ہیں آگے چل کر وہ صاف طور سے بیان کرتے ہیں یہ "عشق" جس کی دنیا کو ضرورت ہے یورپ سے نہیں مل سکتا۔

پیر مغاں فرنگ کی مئے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے
اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درمند کا طرز کلام اور ہے
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقاماور ہے اس کا نظام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی

یہی پیام محبت انھوں نے یورپ سے علی گڑھ کالج کے طلبا، کے نام بھیجا تھا۔

۱۹۰۷ء میں ایک غزل اقبال نے لکھی تھی۔ اس میں اپنے زاویہ نظر کی تبدیلی اور حقیقت حال کے آشکار ہونے کی تفہیم شگفتہ انداز میں کی ہے زمانہ آیا ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا

اسی غزل میں اپنی عالم دوستی کا اظہار یوں کیا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں ،بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنونگا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

نظر اس قدر وسیع ہو جانے کے بعد اقبال کے ذہن سے وطنیت کا خیال بھی نکل جانا ضروری تھا۔ نرالا سارے جہاں سے اس کو

عرب کے معمار نے بنایا نمود ہر شئے میں ہے ،ہماری

ان میں خیالات کو انھوں نے بعد کی ایک فارسی نظم میں بھی ظاہر کیا جو پیام مشرق میں شائع ہوئی ہے۔

گو اقبال مغربی تہذیب سے مایوس ہو گئے تھے لیکن انھوں نے یورپ کے اکثر علماء جیسے شوپن ہار ، نتشے ، ٹالسٹائی ، کارل مارکس ہیگل ، ائن اسٹائن ، بائرن ، پٹوفی ، آگز ں ، کومٹے ، گومئے ،

برگساں، لاک، کانٹ براونگ شکسپیر وغیرہ میں سے جس کسی کی تعریف کی ہے اس قدر دل کھول کر کی ہے کہ ان کی وسیع النظری کا اس سے پتہ چل جاتا ہے۔

اس دور میں اقبال کی ذہنیت کس قدر بلند ہو گئی تھی اس کا ثبوت پہلی ہی نظم سے ملتا ہے جسکا عنوان "محبت" ہے۔ یہ نظم محبت کے اجزائے ترکیبی سے آگاہی حاصل ہونے یا دوسرے الفاظ میں عشق کی حقیقی ماہیت دل پر القاء ہونے کے بعد لکھی گئی ہے۔ حقیقت حسن کو بھی وہ اب سمجھ جاتے ہیں۔

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

ان حقائق کے انکشاف کے بعد وہ اپنا پیام سناتے ہیں۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا
بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے

اس نظم سے اور ذیل کی نظم سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی سعی کا محور بدل گیا۔ لیکن ان کا مذہب وہی باقی رہا جو پہلے تھا یا اگر بدلا تو رنگ و بو کے امتیاز یا مسالک و عقائد کے اختلاف پر مبنی نہیں بلکہ یہ مذہب بسیط عشق ہے۔ مذہب یا عقائد کے لحاظ سے جو کسی کے دوست ہیں نہ دشمن عقائد میں وہ صوفی ہیں اور نظام معاشرت میں مسلمان۔

شان کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشائے کا
دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

اسی خیال کو "سوامی رام تیرتھ" کے عنوان نظم میں اس طرح ادا کیا ہے۔

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لاکے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کی

ان کی حقیقت شناس نظر نے یورپ سے بھی کئی مفید باتیں اخذ کیں ان میں سب سے نمایاں "پیغام عمل" ہے۔ جو یورپی اقوام کا بڑا سرمایہ امتیاز ہے۔ اس کی تلقین ہر جگہ فارسی اور اردو شاعری میں کرتے ہیں۔

مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت
ز منزل جادہ پیچیدہ ، خوشتر
ہمائے علم تا افتد بادامت
یقین کم کن گرفتار شکے باش
عمل خواہی ؟ یقین را پختہ ترکن
یکے جوئے یکے بیں و یکے باش

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

یورپ سے نکلتے ہوئے اقبال نے جو معرکتہ الارا نظم سر شیخ عبد القادر کے نام لکھی ہے وہ گویا اس دور کی شاعری کا لب لباب اور آئندہ دور کی شاعری کا پیش نامہ ہے اس نظم کے لب ولہجہ کی بلندی کو دیکھ کر گرامی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

دیدہ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

اقبال کی شاعری کا اخری دور ۱۹۰۸ء کے بعد کا ہے اسی سنہ میں وہ ہندوستان واپس ہوئے یہ دور در حقیقت اقبال کی شاعری کا زرین دور ہے اس دور کی شاعری نے اقبال کے لیے دنیا کے لازوال شعراء کے زمرہ میں جگہ نکال لی ہے اور اس دور کی شاعری ہی اقبال کی زندگی کا حاصل اور ان کی شعری کوششوں کا منتہا ہے۔

اس دور کی شاعری کی تمہید بہت تھوڑی ہے۔ کیونکہ اشس کا بیشتر حصہ دوسرے دور کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

اقبال نے یورپ میں جو پلان شاعری کا پیدا کیا تھا اب وہ عملی صورت اختیار کرنے لگا ان کی ہمدردی کائنات کے ہر اس ذرہ کے ساتھ تھی جو مصیبت میں ہو۔

ان کا مذہب اور ملک صوفیانہ یعنی "عشق و محبت" تھا ایسا عشق جو کائنات کے ہر ذرہ کے ساتھ ہو ہر ذی حیات کے ساتھ ہو ہر فرد بشر کے ساتھ ہو اور حسن و حیات کے محزج کے ساتھ ہو اسی لیے اس دور کی شاعری کی تلقین بڑے شد و مد کے ساتھ کی ہے۔ عشق ہی ان کو دونوں عالم حکمراں نظر آتا ہے۔ کائنات کے ہر ذرہ کو دوسرے ذرہ کے ساتھ عشق ہے اس لیے ایسی حیات کو وہ بد تر از موت تصور کرتے ہیں جس میں عشق کی تھلک نہ ہو پھر جس طرح قدیم شعرائے اردو نے عشق کے ساتھ وحشت یعنی حرکت کو ضروری سمجھا تھا یہ بھی حرکت یعنی عمل کو ضروری تصور کرتے ہیں عشق تو ایک مذہب ہے اور اس کے ارکان عمل کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔ آخری ترمیم گویا اقبال کا اپنا اضافہ ہے۔

آتی تھی کوہ سے صدا روز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
لیفیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عمل کا میدان وہ صدر اسلام کے اصول کو بتلاتے ہیں شاعر کے عقیدہ میں یہی دنیا کی موجودہ کش مکش کا حل ہو سکتا ہے اور یہی دنیا کے لیے دار الامان بن سکتا ہے۔

خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو!
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

اس اخری دور میں اقبال کی اردو شاعری فارسی شاعری کے مقابلہ میں مدھم پڑ گئی تاہم اردو شاعری فارسی شاعری کا نتیجہ رہی۔ فارسی شاعری کی پوری اسپرٹ اس میں موجود ہے فارسی شاعری کے آغاز اور اس کی طرف زیادہ تر توجہ کے اسباب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن ایک چیز جو یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اقبال نے ایرانی فلسفہ کی جو تحقیقات کی تھیں اس سے انہیں بڑی خاص مدد آئندہ فارسی شاعری میں ملی۔ اپنے مضمون کے لیے انہیں یوں تو سارے مسلمان فلسفیوں کے کارنامے پڑھنے پڑے لیکن وہ مولانا روم سے بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال کے آخری کلام پر مولانا روم کے فلسفہ ہی کا اثر ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی ذہنیت کو معراج کمال پر پہنچانے والا رومی ہی کا کلام ہے جو "مثنوی معنوی" اور "دیوان شمس تبریز" جیسی دو بے حد ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے۔ اقبال کا تصوف ان کی نظر افروزی وسعت جذبات حیات کے رازوں سے آگہی کائنات کے ساتھ انس و محبت اور عشق غرض پوری شاعری کا ڈھانچہ وہ بڑی حد تک حضرت رومی ہی کا ممنون احسان ہے اقبال نے خود اس کا جابجا اعتراف کیا ہے۔

عشق است کہ در جانت بر کیفیت انگیزد
از ناب و تب رومی تا حیرت فارابی
مرشد رومی حکیم پاک ذات
سر مرگ و زندگی برما کشاد

اقبال پر رومی کا اس قدر زبردست اثر تھا کہ انھوں نے اپنی مثنوی اسرار خودی اور رموز بے خودی کی بنیاد ہی مثنوی معنوی کے طرز پر رکھی ہے۔ دونوں مثنویوں کی بحر وہی ہے اور اسلوب وہی آغاز بھی مثنوی ہی کے اشعار سے ہوتا ہے مولانا روم کا اثر اقبال پر بہت قدیم ہے چنانچہ

پہلے دور کی نظموں میں بھی اس اثر کا سراغ ملتا ہے۔

پنہاں درون سینہ کہیں راز ہو ترا
اشک جگر گداز نہ غماز ہو ترا
گویا زبان شاعر رنگیں بیاں نہ ہو
آواز لے میں شکوہ فرقت نہاں نہ ہو
میری صورت تو بھی اک برگ ریاض طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

نے شکوہ برگ ریاض طور اور چمن اس نیستاں کی طرف اشارہ ہے جو مثنوی معنوی کے پہلے ہی شعر میں ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اقبال کا مہتم بالشان فلسفہ "خودی" بھی مولانا ہی سے متاثر ہے۔ صوفی عقائد کے بموجب جب انسان اپنی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے یا اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے تو دونوں صورتوں میں اس کی قوت لامحدود ہو جاتی ہے اس حالت میں کائنات پر حکومت کرنا بھی اس کے لیے ایک معمولی بات ہے لیکن اس خودی کے احساس سے اقبال نے جو کام لیا ہے وہ ان کا اپنا قابل قدر کارنامہ ہے جس کا تعلق بڑی حد تک ہی آج موجودہ حالت اور ضرورت سے ہے۔

اقبال نے اب تک جس قدر فارسی نظمیں لکھی ہیں وہ چار کتابوں کی صورت میں شائع ہوئی ہیں۔

(۱) زبور عجم (۲) اسرار خودی (۳) رموز بے خودی (۴) پیام مشرق۔ ان میں سے آخری تین بے حد اہم ہیں پیام مشرق میں ایک طویل نظم کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی متفرق نظمیں بھی شامل ہیں یہ سب نظمیں بلند پایہ ہیں پیام مشرق کے ذریعہ اقبال نے مغرب کے لیے مشرق کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ المانوی شاعر گوئٹے کا دیوان کا جواب ہے جو مغربی دیوان کے نام سے شائع ہوا تھا۔

رموز بے خودی میں ملت اسلامی کے ارکان سے بحث کی ہے لیکن اسرار خودی محکوم اقوام کے لیے بڑی اہم نظم ہے۔ بظاہر یہ متصوفانہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ محکوم اقوام کی اصلاح ذہنیت کا بڑا آلہ ہے۔ اس میں حاکم اور محکوم ذہنیتوں کا فرق بڑی حکیمانہ قابلیت سے ظاہر کیا گیا ہے اس کا اصلی مقصد اس پستی کو دور کرنا ہے جو محکوم اقوام کے مغالطے کی وجہ سے ان کی ذہنیتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ نظم اقبال کی اکثر نظموں کی طرح بے حد اور بجل خیالات پر مشتمل ہے۔

اس دور کی اردو نظموں میں چار یا پانچ بڑی اور باقی چھوٹی نظمیں ہیں۔ ان میں اکثر نظموں کا تعلق مسلمانوں کی موجودہ حالت سے ہے تمام نظموں کو ہم ذیل کے چار عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) قومی اور وطنی (۲) معاشرتی اور اخلاقی (۳) حکیمانہ (۴) تاریخی

قومی اور وطنی نظموں میں معرکتہ الاراء نظمیں شکوہ جواب شکوہ خضر راہ اور طلوع اسلام ہیں ان کے علاوہ کئی مختصر نظمیں جیسے ترانہ ملی، وطنیت، خطاب بہ نوجوانان اسلام مسلم خاص طور سے توجہ طلب ہیں ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے ہر نظم قومی جذبہ میں حقیقی معنوں میں ڈوبی ہوئی ہے پھر جن الفاظ سے قوم کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ ترانہ ملی اور وطنیت اول کی اسی موضوع کی نظموں کی توسیع یا ترمیم ہے۔ پہلے دور میں اقبال نے کہا تھا سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا ۰۰۰ ہندی ہی ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا اب اس میں یہ ترمیم کی کہ چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ اس اختلاف کی توجیہ وہ خود اس طرح کرتے ہیں۔ ہنذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور ۰۰ ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے تیز بناء ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے۔

شکوہ جواب شکوہ خضر راہ اور طلوع اسلام میں سے کسی نظم کا جواب اردو میں نہیں ملتا۔ شکوہ اور جواب شکوہ میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا شکوہ خدا سے کیا ہے ادھر ابھرنے کی جو ترکیب بتلائی ہے وہ ربانی الہام کی شان رکھتی ہے۔ یہ نظمیں اقبال کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔

معاشرتی اور اخلاقی نظموں کے تحت وہ تمام نظمیں آجاتی ہیں جو تمدن یا تعلیم پر ہیں یا کسی متعلق مضمون پر لکھی گئی ہیں۔ یہی وہ نظمیں ہیں جو بالکل اکبر الہ آبادی کے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں اس دور کی اہم ترین نظمیں اقبال کی حکیمانہ، فلسفیانہ اور متصوفانہ نظمیں ہیں ان میں اقبال کا اصلی کردار جس قدر جھلک رہا ہے کسی اور عنوان کی نظموں میں نہیں تاریخی نظمیں اقبال کی اس وسیع النظری کا ثبوت ہیں جن کا اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں گو اسلامی تاریخ سے متعلق نظمیں زیادہ ہیں لیکن حقیقت میں تخصیص کسی کی نہیں۔ تاریخ کا جو اہم پہلو شاعر کو متاثر کرتا ہے وہ اس پر خیال آرائی کرنے لگتا ہے چنانچہ ان میں حضرت صدیق اکبر پر ایک نظم ہے تو دوسری رام چندر جی پر ہے۔ یہ نظمیں گویا شاعر کے تاریخی تاثرات کی یادگاریں ہیں۔

آخر میں اقبال کی شاعری کی ادبیت کے متعلق بھی چند الفاظ ناگزیر ہیں۔ کیونکہ شاعری بھی کامل فکر اور تخیلی کے ساتھ ساتھ جب تک زبان پر بھی پوری قدرت حاصل نہ ہو حسن گویائی پیدا نہیں ہو سکتا۔ زبان اور خیال دونوں شعر کے لیے ویسے ہی ضروری و لازم ہیں جیسے جان کے لیے قلب بلکہ شعر میں زبان کا جز اس سے زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک اعلیٰ فہم اور ذکی شخص میں اس کے جسمانی حسن کا فقدان اس کی عظمت پر کوئی اثر نہ ڈالے لیکن بہترین خیالات ہی کیوں نہ ہوں جب تک وہ بہترین اسلوب میں ادا نہ کئے جائیں ادب میں بڑا درجہ حاصل نہیں

کر سکتے ۔ اسی لیے بعض نقادوں نے شعر کی یہ خوبی مقرر کی ہے کہ بہترین خیالات بہترین الفاظ میں ادا کئے جائیں ۔

بعض اردو رسالوں نے اقبال کی زبان پر غیر منصفانہ تنقیدیں شائع کی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ ایسے رسالوں نے اقبال کے ان اشعار کو تنقید کے لیے انتخاب کیا جن میں روزمرہ یا محاورے کے لحاظ سے کوئی خامی نظر آئی تھی ۔ بعض بزرگوں نے اقبال کی توجہ فارسی شاعری کی طرف زیادہ دیکھ کر اس کی توجیہ یہ فرمائی کہ اردو رسائل میں اسی طرح کی مضحکہ خیز تنقیدوں نے اقبال کو اردو شاعری سے بر دل کر دیا ہے ۔ لیکن اقبال کی ذہنیت والے شاعر کے متعلق یہ خیال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہم نے پہلے ہی فارسی شاعری پر زیادہ ہمت صرف کرنے کی سبب بتلادیا ہے ۔

اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر غور کرتے وقت تنقید نگار کو کئی امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے ممکن ہے کہ اقبال کا پورا فارسی کلام سلاست اور روانی کے ایک ہی اعلیٰ معیار پر نہ ہو اور یہ ہو نہیں سکتا یا اس کے ہر شعر میں حافظ کی سی شیرینی اور سعدی کی سی سادگی اور صفائی موجود ہو لیکن اس سے ان کی عظمت پر کیا حرف آسکتا ہے جبکہ مولانا روم جیسے شاعر کا پورا کلام خوبی کے ایک ہی معیار پر نہیں ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ مولانا رومی کو بھی بعض جگہ محاورے اور زورمرہ کی پابندی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے اردو کلام پر اعتراضات کا بھی یہی جواب ہے اردو میں میر اور سودا جیسے قدیم شاعروں کو چھوڑ کر جن کی ہر بات متوسطین کے لیے نمونہ تھی انیس سے لیکر حالی تک بھی کسی شاعر کا کلام اعتراضات سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ انیس کے پرستار شبلی اکثر اعتراضات کو دور کرنے کے بعد بھی خامیوں کے واضح کرنے سے نہ رک سکے اقبال کا کلام پھر کس طرح خطا سے پاک رہ سکتا ہے ۔ ایک بڑے نقاد نے سچ کہا ہے کہ سقم ہی کسی کارنامہ کے انسانی ہونے کی دلیل ہے ۔

فارسی کی طرح اردو میں بھی غزل کی زبان اس قدر منجھ گئی ہے کہ کسی غزل گو شاعر کو زبان کی تمام پابندیوں کا لحاظ رکھنے میں دقت نہیں ہوتی اور جو لوگ خیال کو قربان کر کے صرف زبان کا غلام بننا اپنا ایمان سمجھتے ہیں وہ اس ڈگر سے کسی کو ہٹتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے حالانکہ تغزل کے علاوہ دوسری شاعری کا اصول ہی جدا ہے خاص کر اس شاعر کے لئے جس کا مطمح نظر مضمون موضوع اور خیال کی اہمیت ہے زباں کی بعض غیر اہم بندشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے شیکسپیئر قدیم زمانہ کا شاعر تھا تو براؤننگ جیسے جدید شاعر کے خیالات بھی بعض وقت زبان کی پابندیوں کو توڑ کر باہر نکل جاتے ہیں انگریزی کی طرح فارسی اور اردو کی شاعری پر بھی ایک دور لفظی صناعی کا گذرا ہے اس زمانہ کے لسانی معیار کو سامنے رکھیں تو یقیناً بعد کے شاعروں کا کلام کہیں کہیں پھیکا یا سقیم نظر آئے گا ۔ نقاد کو ہر معاملہ میں نصب العینی ہی نہ بن جانا چاہیئے بلکہ حقائق بھی اس کے پیش نظر رہیں

فارسی اور اردو دونوں میں اقبال کا کلام ایک قابل قدر اضافہ ہے خواں زبان کی حیثیت

سے ہو یا مضامین کی فارسی زبان میں اقبال نے اپنے زمانہ کی ضروریات سے متعلق بہت ہی اہم اصطلاحات الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اس زمانہ میں جبکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی شاعری خواہ کے معیار سے بالکل مختلف اور جدید الفاظ اور ترکیبوں کا مرکب بن گئی ہے اقبال نے قدماء کے معیار زبان ہی کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے ان کے کلام کو پڑھ کر اکثر جگہ کسی قدیم شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اقبال کو اپنے زمانہ کا بڑا فارسی شاعر بنا رہی ہے۔

اردو زبان کی جو خدمت اقبال کی شاعری انجام دیتی ہے وہ فارسی سے زیادہ مہتم بالشان ہے غالب کی غزلوں کو چھوڑ کر اردو میں سوائے اقبال کے کوئی شاعر ایسا موجود نہیں ہے جس کے کلام میں اعلیٰ خیالات بھی ہوں اور پاکیزہ زبان بھی اقبال کے کلام کے مقابلہ میں آزاد بلکہ خود حالی کے کلام میں بھی شا اور ادبیت کم معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری کو جو سودا، درد، میر حسن میر انیس، ذوق غالب اور داغ کے معیار سے جانچنا ہی ظلم ہے اقبال کا میدان اپنا جدا ہے جس کے وہ تنہا ہیں انھوں نے اپنے لیے شاعری کی جو دنیا پیدا کی ہے اس کے لوازم حسن صرف محاورہ اور روزمرہ نہیں ہیں اقبال نے اردو میں جتنے نئے اور خوبصورت الفاظ تراشے ہیں جتنی اور جیسی ترکیبیں وضع کی ہیں اور نفیس تشبیہوں اور استعاروں کا جس قدر ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اس کی تفصیل کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے یہاں ان کے صرف چند نمونے بے موقع نہ ہونگے۔ اس حیثیت سے تو اقبال کی عزت ہماری نظر میں تو اور بھی بڑھی ہوں۔

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینہ سیال ہے
دامن موج ہوا جس کے لئے رومال ہے

بلبیر پرشاد بھٹناگر

اقبال کا ذوق آگہی

ایک تو شاہان اودھ کے دربار کی قدر افزائی اور اس پر زبان اردو کا عین ارتقائے شباب پھر کیا تھا سونے پر سہاگہ، آتش کی مرصع سازی ناسخ کی قیود الفاظ و قوانی انشا اور رنگین کی ریختی اور محاورہ دانی غرض طبقہ متوسطین کی آبیاری حسن عشق نے جہاں اس کی دلفریبی میں چار چاند لگائے وہاں یہ نوخیز حسینہ بھی جامہ حیاسوزی زیب تن کر کے خوب ہی کھل کھیلی اور کچھ ایسے شگوفے کھلائے کہ اہل ہوش تو اس ساقی کے حسن سحر آگیں سے مسحور ہو کر مئے عشق کے متوالے بن ہی گئے مگر اس کے دوسرے عشاق کا تو کہنا ہی کیا جس طرح موسم برشگال میں حشرات الارض کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اسی طرح ان کی تعداد بھی دن دونی رات چوگنی بڑھتی چلی جاتی تھی اور جہاں انہوں نے اس کی پاکیزگی کو مٹا دینے کے منصوبے باندھے وہاں کمر ہمت باندھ کر اس کی تخریب عزت پر بھی تلے نظر آتے تھے۔ آخرش منڈی دل کی صورت میں اس کی نشوونما کے درپے ہوئے ادھر خود اس کی حالت زبون و خستہ تھی۔ وہ ارمان اور امنگ تابہ کے پروانے کے۔ ولولے سرد ہو چکے تھے۔ لے دے کے جو کچھ قدر و منزلت رہ گئی تھی وہ بھی انقلاب زمانہ کے دست تطاول سے محفوظ نہ رہ سکی، کلنک کا ٹیکہ ماتھے پر لگ چکا تھا۔ سیاہ داغ بدنامی سپیدی دامن پر نقش ہو چکا تھا۔ مگر پھر سنبھلی اپنے افعال دیرینہ پر متاسف ہوئی اور چونکہ اس پشیمانی میں اس کے چہرہ سے صدق دلی کی جھلک نمایاں طریق پر ہویدا تھی۔ چند اہل ہمت فرشتہ رحمت بن کر اسکے آڑے آئے انہوں نے اس کے گلزار حسن کو نئے سرے سے ترتیب دیا، برگہائے حیاسوزی غنچہ ہائے بداخلاقی اور ثمرہائے بوالہوسی کو آخرش چمن سے صاف کر کے ان کی جگہ بوستان مغرب سے مشاہدہ قدرت اعلیٰ اخلاق اور اصلاح قوم وغیرہ اشجار لا کر نصب کئے اور اہل مشرق سے خراج تحسین حاصل کیا۔

گو اس کام کا آغاز حالی جیسے اہل سخن کے قلم معجز رقم اور آزاد جیسے انشا پرداز کے کلک اعجاز بیان سے ہوا تھا مگر اس دور جدید کے بہترین نمایندہ علامہ اقبال ہیں جن کی شاعری نے تمام عالم کو مسخر کر لیا ہے انہوں نے جو معیار شاعری پیش نظر رکھا وہ اس پر پورے اترے چنانچہ شاعر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

جب مئے درد سے ہو خلقت شاعر مدہوش
آنکھ جب خون کے آشکوں سے بنے لالہ فروش
دل میں موجود ہوں خاموش خیالوں کے خروش

شعر کو سوئے زمیں عرش سے لاتا ہے سروش

اور یہاں آپ کا ایک ایک مصرع آپ کے ایک ایک دور شاعری کی خبر دیتا ہے ۔ جیسے جیسے آپ کے نظریہ میں ارتقا ہوتا گیا ہے اسی طرح آپ کی شاعری بھی رنگ بدلتی چلی گئی پہلے مصرع میں آپ مئے درد کا ذکر فرماتے ہیں اور یہ اسی جگہ نہیں، بلکہ یہی درد ہے جس کا اقبال نے بارہا اپنی نظموں میں ذکر کیا ہے اور جو ان کی شاعری کے دور اولیں کی خصوصیت ہے اسی نے اقبال کو "زخمی شمشیر تجسّجو" بنایا اس کی کسک کے باعث انہوں نے اپنے دل کو سراپا "ذوق استفسار" پایا اور اسی کے اظہار کی خاطر انہوں نے مختلف تراکیب مثلاً ذوق جستجو، درد استفہام، تلاش متصل، سعی لاحاصل ۔ کوشش ناتمام وغیرہ ایجاد کیں اس جگہ اس امر کی وضاحت لازم ہے کہ حضرت اقبال کا مفہوم شاعری آتش کے خیال کے مطابق ۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

مرصع سازی نہیں اور یہ حق ہے کہ اکثر اہل سخن کو ان کی زبان دانی ان کے محاورات حتی کہ ان کے استعمال الفاظ اور تذکیر و تانیث پر بھی اعتراض ہے مگر ان کا ذوق سلیم ان کو ان زوائد میں پڑنے سے باز رکھتا ہے اور ایک یونانی حکیم کے خیال کے مطابق وہ راہ میں سرائے کی خوبصورتی دیکھ کر وہیں کے نہیں ہو رہتے بلکہ وہ ان دلکش مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنی راہ چلے جاتے ہیں وہ شاعری کے اصلی جوہر، نفس مضمون پر اپنی انتہائی قوت صرف کرتے ہیں اور ان کا انداز بیان دل میں نشتر کی طرح پیوست ہو جاتا ہے ۔ کلام میں نفس مضمون کی اہمیت سمجھنے کے باعث ہی ان کا کلام ان کے خیالات کے ارتقاء کا بہترین مرقع ہے ان کی نظمیں بالعموم خیالات کے ہی تابع ہوتی ہیں اور آئینہ کلام میں بھی اس کا عکس واضح طور پر نمایاں ہے ۔ پہلے دور میں وہ راز حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ۔ راز کائنات کی جستجو ہی اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہیں وہ راز ہستی سے واقف نہیں چنانچہ اس عدم واقفیت کا اظہار خود ان کی زبانی ملاحظہ فرمائے ۔

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مگر چونکہ اقبال کے پہلو میں ایک درد بھرا دل ہے وہ مجبوراً اس راز کے استقصاء کے جانب اپنی عنان توجہ منعطف کرتے ہیں گو ناکامی ہم رکاب بن جاتی ہے پر ایک بلند خیال اور عالی حوصلہ شاعر اپنی ان

تھک کوششوں میں مصروف ہو جاتا ہے اس کے دل کو لگن لگی ہوئی ہے "دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا اسی کے زیر اثر اسکو اپنی ناکامی میں بھی ایک خاص کیفیت حاصل ہوئی ہے جو اس کو سرمست اور سرشار بناتی ہے اور بددل ہونے سے باز رکھتی ہے۔

آرزو نور حقیقت کی ہماری دل میں ہے
لیلیٰ ذوق طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
کسقدر لذت کشود عقدہ مشکل میں ہے
لطف صد حاصل ہماری سعی لاحاصل میں ہے

وہ محض اس جذبہ سے متاثر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کو انسان کے واسطے طرہ امتیاز خیال کرتا ہے وہ قدرت کی دوسری اشیاء سے مخاطب ہوتا ہے اور ان پر اپنی فضلیت کا اظہار کرتا ہے چنانچہ گل رنگین سے خطاب کرتے ہیں۔

اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

گل زیب محفل ہوتے ہوئے "شورش محفل" میں شریک نہیں چمن سے دور ہونے کے باعث شاعر تو نالہ کش و سرگرم تلاش ہے مگر گل رنگین خاموش و مطمئن۔ آخرش شاعر اس کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے خیال میں اس کا باعث اس کے سوا اور کچھ نہیں جس کو وہ نہایت خوبی کے ساتھ ایک ہی مصرع میں اس طرح نظم کرتا ہے۔ ع۔ "اے گل رنگین ترے پہلو میں شاید دل نہیں" اور اسی لئے وہ پھول پر اپنی فضیلت و برتری کا ادعا کرتا ہے ذرا گل رنگین کی بوئے لطیف سے مشام دل و جاں کو تازہ کیجئے

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں
یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغ خانہ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایہ قوت نہ ہو
رشک جام جم مرا آئینہ حیرت نہ ہو
یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے
توسن ادراک انسان کو خرام آموز ہے

شاعر دیدہ بینا سے ایک دلفریب تماشہ کا مشاہدہ کرنے کے واسطے بیتاب ہے

ڈھونڈھتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشہ چاہیئے

چشم بینا جس سے کھل جائے وہ جلوہ چاہیئے

اور وہ اسی تماشہ کے دھیان میں محو ہے کہ آفتاب عالمتاب کے سوز کو دیکھ کر اس کو بھی اپنی طرح زخم خوردہ اور آفت رسیدہ تصور کرتا ہے اور یہ خیال کرکے کہ شاید یہاں ہی اس کو اپنے درد کا درماں میسر آجائے وہ اس کو اپنے ذوق استفہام سے بھی آگاہ کر دیتا ہے مگر ناکامی یہاں پر بھی اس کا دامن نہیں چھوڑتی اور اس کو جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ جس کی تائید سے وہ مداوائے درد دل کا خواہاں تھا وہ ابھی اس درد کی لذت سے بھی آگاہ نہیں اور اگرچہ وہ اپنی سعی جستجو میں ناکام رہتا ہے مگر یہ ناکامی اس کو آفتاب پر بزرگی عطا کرتی ہے یہی اسکو دستار فضیلت پہناتی ہے اور وہ آفتاب پر اپنی برتری کا ان الفاظ میں دعویٰ کرتا ہے۔

تو اگر زحمت کش ہنگامہ عالم نہیں
یہ فضیلت کا نشاں اے نیر اعظم نہیں
اپنے حسن عالم آرا سے جو تو محرم نہیں
ہمسر یک ذرہ خاک در آدم نہیں
نور مسجود ملک گرم تماشا ہی رہا
اور تو منت پذیر صبح فردا ہی رہا

اسی مضمون کو اور زیادہ واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

درد استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے راز قدرت کا شناسا تو نہیں

ماہ نو سے بھی اسے کچھ ڈھارس بندھنے کی امید تھی مگر وہاں بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور مجبوراً کہنا پڑا۔

پھر بھی اے ماہ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو

قدرت کی دیگر اشیاء کی حقیقت بھی اس پر روشن ہو گئی اور اس نے اس کا انکشاف ہی بہتر سمجھا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

ہاں شب تاریک میں ایک شمع گریاں کو اس نے ہمراز پایا تھا مگر اس کے پہلو کو بھی درد استفہام سے خالی پاکر اس پر بھی اپنی فوقیت کا اظہار یوں کرنا پڑا۔

ی ہے تو کہ برق تجلی سے دور ہے
بیدرد تیرے درد کو سمجھے کہ نور ہے
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں
بینا ہے اور سوزدروں پر نظر نہیں
میں جوش اضطراب سے سیماب وار بھی
آگاہ اضطراب دل بے قرار بھی
تھا یہ بھی ایک ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

اور یہی احساس گداز جو نظام عالم میں رفعت و پستی کا سبب ہے۔ اس کے چمن دل میں ذوق جستجو کا پودا لگاتا ہے وہ اس کی آبیاری کے واسطے ایک نامعلوم چشمہ کی تلاش میں سرگرم نظر آتا ہے وہ دوسری اشیاء سے طالب امداد ہوتا ہے مگر درد استفہام سے ناآشنا ہونے کے باعث کوئی بھی اسکی تائید نہ کر سکتا تھا اور نہ کر سکا پس وہ سیماب وار تڑپتا ہے اور ہر دم بیکل اور بے چین رہتا ہے۔

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے
گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی

مگر درد کا علاج معدوم۔ غرض جب قدرت کے آئینہ میں اسے کہیں بھی اپنے درد کا عکس لطیف نظر نہ آتا اور دیگر اشیاء کی تائید بھی اس راز کی عقدہ کشائی میں بیہودہ اور لاحاصل ثابت ہوئی تو اس ناکامی نے شاعر کے ذوق جستجو کے واسطے اور ایک دہکتے ہوئے شرارہ کا کام کیا جس نے اس کے سینے میں ایک آگ مشتعل کر دی درد کا احساس تو پہلے ہی سے تھا اب وہ "کشود عقدہ مشکل" کے لئے بیتاب ہو گیا ایک طرف سے ناامید ہو کر اب اس نے میدان جستجو کو اور وسیع کیا اور دوسرے مقامات میں تلاش شروع کر دی اسی بے کلی میں وہ خفتگان خاک سے بھی استفسار کرنے سے باز نہ رہ سکا۔

اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم ؟
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانہ امروز و فردا ہے کوئی ؟

اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی ؟
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا ؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا ؟
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا ؟
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا ؟
وہاں بھی انساں اپنی اصلیت سے ہیں بیگانے کیا ؟
امتیاز ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا ؟
واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا نہیں ؟
اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں ؟
اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے ؟
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کا آرام کیا ؟
واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا ؟
تم بتادو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے

اسی ذوق جستجو کی خاطر اس نے کیا کیا "سرگذشت آدم" میں بہ احسن اسلوب بیان کیا گیا ہے۔

رہی حقیقت عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوج خیال فلک نشیں میں نے
نکالا کعبہ سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلاف معنیٔ تعلیم اہل دیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکار عقل دوں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانہ پر
لگا کے آئینہ عقل دوربیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برق مضطر کو
بنادی غیرت جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! راز ہستی کی

یا اشعار مندرجہ ذیل جن میں ان تکالیف کا بیان ہے جو اس نے برضا و رغبت خویش برداشت کیں اس کی جگر سوزی اور ہمت کی دلیل روشن ہیں۔

ہے جنوں مجھ کو کہ آبادی میں گھبراتا ہوں میں
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں
شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے
اور چشموں کے کنارے پر سلاتا ہے مجھے

مگر راز ہستی سے واقفیت نہونی تھی نہوئی اسی طرح ناکامیوں کا منہ دیکھتے دیکھتے اس نے خرد کا دامن پکڑا علم کو ہادی بنایا مگر عقل کا چراغ بھی اس تاریکی میں اس کا رہنما نہ بن سکا ناچار بے چارگی کو اس طرح نظم کیا

مگر خبر نہ ملی آہ ! راز ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو ہتہ نگیں میں نے

یا ملاحظہ ہو

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود　　گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود

شاعر محض اتنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ درد عشق میں بھی اسی خیال کو اس طرح الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔

غافل ہے تجھ سے حیرت علم آفریدہ دیکھ
جو یا نہیں تری نگہ نارسیدہ دیکھ
رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو

مگر سعی پیہم ہی کلید کامیابی ہے آخرش اس کی ناکامی دیکھ کر لسان الغیب خواجہ حافظ اس راز سے اسے یوں آگاہ کرتے ہیں۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست　　کہ ما دو عاشق زاریم دکار ما زاریست

نظیری نے اسی عقدہ کو اس طرح کھولا۔

حدیث حسن و مشتاقی درون پردہ پنہاں بود　　برآمد شوق از خلوت نہا دایں راز برصحرا

میر نے اس ادراک انسانی سے بالاتر طاقت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

محبت سے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب ، محبت سبب

محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت ہی اس کارخانہ میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانہ میں ہے

اس ارشاد نے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے "خزانہ پوشیدہ تھا پس میں نے معلوم ہونے کی خواہش کی بنا بریں مخلوق کو خلق کیا تا پہچانا جاؤں" اقبال کو حقیقت سے خبردار کیا جو اب تک مانع آگہی راز حقیقت تھا ان کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھ گیا اور چشم بینا نے جو کچھ مشاہدہ کیا دل نے اس کو محسوس کیا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اقبال نے ایک آہ سرد کھینچی اور چونکہ اب اقبال کا دل ان کا نہیں رہا تھا، بلکہ بقول سمینہ سوختہ اقبال کہ جن کو غضب کی آگ رکھنے والے پانی کے ایک چھوٹے سے شرارے یعنی قطرہ اشک محبت نے پھونک ڈالا، انکا دل دام عشق میں پھنس کر رہا ہو گیا اور یہ پرندہ نو گرفتار دام محبت اسی سہ حرفی عشق کے جذبہ کے زیر اثر اپنے آشیانہ یعنی در معشوق کی تلاش میں سمینہ سے نکل کھڑا ہوا چنانچہ فرماتے ہیں۔

جلوہ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب
پالتا ہے جسے آغوش تخیل میں شباب
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

مگر جب وہ حسن بے پردہ کہیں نظر نہ آیا اور شاہد غیبی نے اپنے بیماروں پر بالکل ترس نہ کھایا تو زحمت کش درد غم نے ایک نالہ پر خروش بلند کیا۔

آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں   خاتم دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

اور خلش پیکان ہجر کو اس طرح بیاں کیا

- - - - - - - - - - - - - - - - مدتوں بیتاب موج بحر کی صورت رہا
مدتوں ڈھونڈا کیا نظارہ گل خار میں   آہ وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

کیا یہ کسی بدنصیب فرقت زدہ کی آواز نہیں۔

ساتھ اے سیارہ ثابت نما لے چل مجھے   خار حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے

اور کیا یہ کسی ہجر کے مارے کی پر درد آہ نہیں۔

ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی مرے دل سے
زحمت تنگی دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

آخر باعث جدائی بیکسی و بے چارگی اور شوق دید کا اظہار فرماتے ہیں۔

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
شام فراق صبح تھی میرے نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں
یاد وطن فسردگی بے سبب بنی
شوق نظر کبھی کبھی ذوق طلب بنی

کسی کو کیا خبر تھی کہ ایک روز ملائے رومی کی طرح ایک اور شاعر رادی کے کنارے تڑپ تڑپ کر کسی کی جفا کو یاد کر کے حرف شکایت زبان پر لائے گا۔

ہمچو نے از نیستان خود حکایت میکنم بشنو اے گل از جدائیہا شکایت میکنم

اور اپنے درد فراق اور غم ہجر کی داستان اس طرح بیان کریگا۔

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

مگر عاشق اس درد و محن کا مطلق خیال نہیں کرتا تکلیف و غم کا اس پر بالکل اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی زبان سے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

کا اقرار کرتا ہے تلاش معشوق میں اپنے کو مٹا دینے کی خواہش ہی شاید اس کو معشوق کی نظروں میں وقعت عطا کرتی ہے شاہد حقیقی اپنے عاشق صادق کی دلنوازی کی خاطر بے پردہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ مگر اس پر ایک کیفیت یاسکتے کا عالم طاری ہو جاتا ہے جو ابھی چاند کو مخاطب کر کے اپنی بے بسی اور بد نصیبی کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا تھا۔

آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں
آہ میں جلتا ہوں سوز اشتیاق دید سے
تو سراپا سوز داغ منت خورشید سے
زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں

تو فروزاں محفل ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے

اب اسے اپنے معشوق کے دید کی خبر سے مطلع کرتا ہے اور اس کیفیت کو جو اس کی دید سے اس پر طاری ہو جاتی ہے بیان کرتا ہے۔

مہر کا پرتو ہے تیرے حق میں پیغام اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوہ حسن ازل

مابعد اس پر اصل حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، دنیا میں اس کو ہر چہار جانب حسن ہی حسن نظر آتا ہے۔

ع۔ جدہر دیکھتا ہوں ادہر تو ہی تو ہے

اور اب ہمہ گیری، حسن کا قائل ہو جاتا ہے اس پر بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ کائنات حسن سے مملو ہے جگنو کیا ہے اس کے خیال میں

حسن قدیم کی ایک پوشیدہ سی جھلک تھی لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

اسی اصلیت کے ثابت کرنے کی خاطر ہی وہ کائنات کی دیگر اشیاء کے بارے میں اس طرح لب کشا ہوتا ہے۔

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی جگنو کو روشنی دی
رنگین نوا بنایا مرغان بے نوا کو
گل کو زبان دیکر تعلیم خامشی دی
نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی روشنی دی
رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی
سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی
حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا

واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

گلشن عالم کا ایک ایک پتہ، دریائے کائنات کا ایک ایک قطرہ، محفل کون و مکاں کا ایک ایک ذرہ کشش حسن سے خالی نہیں یہ اجرام فلکی کی رگ و پے میں خون کی طرح دورہ کرتا ہے اور اجسام خاکی و اجسام مادی کو اپنی ضیا پاشیوں سے نورانی بناتا ہے حسن کی اس عالمگیر حکمرانی کا تذکیرہ "سلمیٰ" کی نظم میں بہترین طریق پر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے
خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جسکو دل کے ظلمت کدہ میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بنکر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں
ہر شئے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اسکا
آنکھوں میں ہے سلمیٰ تیری کمال اسکا

یہاں پر سلمیٰ سے نور حسن ازل کے علاوہ اور کیا مراد لیا جاسکتا ہے۔ مگر کائنات میں حسن ہی حسن دیکھکر اسکے دل کو تشفی نہیں ہوتی۔ قدرت کی ہر شئے میں نور حسن ازل کا ظہور کائنات میں ہر جا مہر ابدی کی ضیا پاشی دنیا کی ہر شئے حسین دلاویز و خوبرو لیکن۔

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے

زندگی اس کی مثال ماہی بے آب ہے

کیا حسن انسان کے دل کو بھی نورانی بناتا ہے کیا کائنات محض تفسیر حسن ہے ؟ کیا کائنات کی زیست کا دراومدار حسن پر ہی ہے نہیں اپنے دل کی تاریکی اور سینہ کی ظلمت کو دور کرنے کی خاطر شاعر کسی اور ہی شئے کا متلاشی ہے وہ ظلمت کو نور سے مبدل کرنے کے لئے کائنات کے دیگر اجزاء سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے راحت دل اور تسکین قلب کے حصول کی خاطر اسی شے گم گشتہ کی جستجو میں کوہ و صحرا کی خاک چھانتا ہے وہ مجنوں بنکر رہ بادیہ نوردی اختیار کرتا ہے اور ہر شئے سے اپنے دل کی تسکین کے واسطے علاج دریافت کرتا ہے، آخر وہ بھی اس کی مساعی سے متاثر ہو کر اپنی اپنی فہم کے مطابق نسخہ تجویز کرتے ہیں۔

آتی ہے کوہ سے صدا راز حیات ہے سکون کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

گل زندگانی کو تبسم کہتا ہے۔ چاند اور تارے جنبش کو زندگی کا مقصد قرار دیتے ہیں۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

مگر شمع نے گریہ غم بتا کر اس کو اصلیت سے خبردار کیا شمع ہی نے اسے بتایا۔

شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز غم کدہ نمود میں شرط دوام اور ہے

اور ابھی زبان شمع سوز و غم کے الفاظ کو پوری طرح سے ادا بھی نہ کرنے پائی تھی کہ عاشق صادق و باوفا کو شفا کلی نصیب ہو گئی۔ خدا جانے ان الفاظ میں کیا جادو بھرا تھا کہ ان کے گوش گذار ہوتے ہی جانباز نے درد سے رہائی پائی۔ حق تو یہ ہے کہ یہ جذبہ اسکے واسطے نیا نہ تھا بلکہ ایک مرتبہ پیشتر بھی وہ اسی کی بدولت گرویدہ حسن ہو گیا تھا۔ مگر پہلے درد اشتیاق دید کا مارا اور ہجر معشوق کا ستایا مضطرب و بیقرار عاشق اس کی بدولت اپنے معشوق کے جلوہ سے شاد کام ہوا تھا۔ مجبور و معذور انسان جب استقصائے راز ہستی کے واسطے اپنی کوشش ناتمام میں اسی رہبر نے اس کو کائنات کے ایک جزو عظیم سے آگاہ کیا تھا۔ مگر چوں کہ یہ جزو عظیم ہی محض باعث ہستی نہیں تھا اسی وجہ سے اسکی روح کسی گم گشتہ شئے کی تلاش میں مصروف تھی اور اس کا ذوق جستجو بھی پہلے کی مانند راز ہستی معلوم کرنے کے لئے بیقرار، لیکن اب اس پر یہ راز آشکارا ہو گیا کہ وہ شئے گم گشتہ اور کچھ نہیں بلکہ وہی بادی دیرینہ ہے کہ جو عقل و علم کی معذوری کو اہل دنیا پر ببانگ دہل منکشف کرتا ہے۔

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے تو خدا جو خدا نما ہوں میں

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا حسن
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

یہی رہنما اس کو پیام عشق سناتا ہے۔

قناعت شعار نہ بن، کمال شان سکندری سے حاصل نہیں۔

تمام ساماں ہے تیرے سینہ میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

یہاں تک کہ خود اقبال کو عشق کی بزرگی اور عقل و خرد کی معذوری کا احساس ہو جاتا ہے۔

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

اور ان کے دل پر اسکی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

جس طرح رفعت شبنم ہے مذاق رم سے میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

اور وہ اس گداز کی مدح میں اس طرح نغمہ سرا ہو جاتے ہیں۔

شیشہء دہر میں مانند مئے ناب ہے عشق
روح خورشید ہے خون رگ مہتاب ہے عشق
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اسکی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شئے میں جھلک ہے اسکی
کہیں سامان مسرت کہیں ساز غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

حسن کے علاوہ کائنات کی ہر شے فانی ہے مگر ان کے خیال میں اس جذبہ کو بھی بقائے دوام حاصل ہے چنانچہ عشق اور موت کا مکالمہ اس بیان کی حجت سے باہر ہے خود قضا کی زبانی عشق کی بزرگی ملاحظہ ہو۔

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اسکے پارا
شرر بن کے رہتی ہے انسانکے دلمیں
وہ ہے نور مطلق کی آنکھوں کا تارا
ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو
وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا

عشق میں سوز لازم ہے اور سوز ہی عشق کی ایک ایسی کیف آور ہنسی ہے کہ جس کا دوسرا نام بقا ہے چنانچہ اقبال اس مضمون کو اس طرح نظم کرتے ہیں۔

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر
اندھیرے میں ہو نور کا کیا گذارا
بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ

قضا تھی شکار قضا ہوگئی وہ

عشق کی ابدیت کے مضمون کو اقبال نے اپنی کئی نظموں میں بیان کیا ہے چنانچہ فلسفہ، غم میں بیان کرتے ہیں۔

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی زندہ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے جام اجل شرمندہ ہے
عشق سوز زندگی ہے تاابد پائندہ ہے
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مرجاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ستارہ صبح میں بھی اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اسکی بنا مثال ابد پائیدار ہے اسکی

اور ان مئے عشق کے بدمستوں کے خیال کے مطابق محض اس جذبہ کو ہی فنا نہیں ہے بلکہ وہ سینہ بھی جس میں یہ احساس جاکر آباد ہوتا ہے۔ زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

اس حد تک اقبال پر واضح ہو جاتا ہے کہ کائنات کے اجزائے عظیم حسن اور عشق ہیں حسن عالمگیر اور عشق ابدی و لامحدود حسن جو دنیا کی تمام اشیاء پر حکمراں و مسلط ہے عشق جو محض انسانی دنیا تک محدود نہیں بلکہ جسکی لذت کا احساس حیوانوں تک میں موجود ہے چنانچہ اقبال اپنی "۔۔۔کی گود میں بلی دیکھ کر" عنوان والی نظم میں فرماتے ہیں۔

خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں صورت دل یہ ہے ہر چیز کے باطن میں مکیں

یا پروانہ کی داستان کو اس طرح لب پر لاتے ہیں۔

کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے
پروانہ اور ذوق تمنائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

یہاں تک کہ وہ غیر جاندار اشیاء مثلاً دریا کو بھی مئے عشق حقیقی سے سرشار پاتے ہیں چنانچہ اس کو مخاطب کر کے اس کے جذبہ عشق کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

ابتک شعرانے محض بلبل میں ہی عشق کی تصویر دیکھی تھی۔

آعندلیب مل کر کریں آہ وزاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

مگر اب اقبال نے ایک مرتبہ پھر لسان الغیب کے نغمہ خوابیدہ۔

سرحب ازلی در ہمہ اشیا ساریست

ورنہ بر گل نزدے بلبل شیدا فریاد

کو بیدار کیا انہوں نے عالم کی تمام جاندار و غیر جاندار اشیاء کے کاشانہ کو اس جذبہ لطیف سے معمور پایا۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

یا

ریاض ہستی کے ذرہ ذرہ سے ہے محبت کا جلوہ پیدا

حقیقت گل کو جو تو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

لیکن انسان پھر بھی انسان ہے اس کو اس جہان کی دیگر اشیاء پر فوقیت حاصل ہے کیوں؟ اس کا جواب پیشتر ہی رقم پاچکا ہے یعنی احساس عشق آگہی گداز یا درد استفہام کی بدولت انسان اشرف المخلوقات ہے اسی احساس آگہی۔ درد کے باعث وہ دیگر اشیاء سے افضل و اعلیٰ ہے یہی اسکو خواہش وصال پر آمادہ کرتا ہے اور اس کے سینہ میں ذوق کے طلب کا بیج بوتا ہے یہاں تک کہ اسکی آواز ایک پر درد نالہ بن جاتی ہے۔

مرے خورشید کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بیتاب

وہ نظارۂ محبوب سے شاد کام ہوچکا ہے چنانچہ خود ذکر کرتا ہے کہ سحاب حسن "اند کے بر غنچہ ہائے آرزو وبا رید ورفت" مگر اب وصال دائمی کی خاطر بے چین ہو اٹھتا ہے مجنوں عشق تلاش محمل لیلی میں ہر ایک شخص سے بھی دریافت کرتا ہے۔

شور لیلیٰ کو کہ باز آرایش سودا کند خاک مجنوں را غبار خاطر صحرا کند

وہ حسن کا متلاشی اور عشق کا دیوانہ قرب حقیقی کی خاطر مضطرب ہے۔

تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں

عکس آباد ہو تیرا میرے آئینہ میں

زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لئے

روشنی ہو ترا گہوارہ مرے دل کے لئے

وہ شاہد حقیقی کو مخاطب کر کے رحم و کرم کی درخواست گذرانتا ہے اشعار مندرجہ ذیل اسکے دل کی تڑپ اور خواہش وصال کی ایک خوبصورت تصویر ہیں۔

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوہ کی ہے
مضطرب ہوں دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں
بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
سوز و ساز جستجو مثل صبا رکھتا ہوں میں
جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے درد لا دوا رکھتا ہوں میں
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلی مدعاء رکھتا ہوں میں
محفل ہستی میں جب ایسا تنک مایہ تھا حسن
پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں

اگر ان اشعار میں ایک طرف شاعر وصال معشوق کے لئے سرگردان و پریشان اپنی کوششوں میں مصروف ہے تو دوسری جانب آخری شعر حسن طلب میں بے نظیر ہے مگر معشوقوں کی بیوفائی زبان زد عام ہے اور ان کی جفا کیشی ضرب المثل ذرا عاشق مہجور کی داستان غم سے ان کا اندازہ لگائیے۔

سکوت شام جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

یہ کیفیت ہے میری جان ناشکیبا کی
مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز
یونہی میں دل کو پیام شکیب دیتا ہوں
شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

اور یہ غم کہاں تک طول کھینچتا ہے خود اسی کی زبانی ملاحظہ ہو۔

خود تڑپتا تھا چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگین نواپاتا تھا شرماتا تھا میں
میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا سیماب تھا

ارتکاب جرم الفت کے لئے بیتاب تھا
نامرادی محفل گل میں مری مشہور تھی
صبح میری آئینہ دار شب دیجور تھی
از نفس در سینہ چوں گشتہ نشتر داشتم
زیر خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

آخر کار عشق کے توسط سے محفل معشوق میں رسائی تو حاصل ہو جاتی ہے مگر کب جبکہ عاشق جاں نثار عشق کی آخری منزل طے کر چکا چنانچہ فرماتے ہیں۔

حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا
قافلہ ہو گیا آسودہ، منزل میرا

کیا یہ شعر ان کے وصال کا شاہد نہیں۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبی، قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

اور کیا یہ بیت ان کے وصال کی حجت نہیں۔

غازہ، الفت سے یہ خاک سیہ آئینہ ہے اور آئینہ میں عکس ہمدم دیرینہ ہے

کہاں اقبال۔ ع۔ "میرے خورشید ذرا تو بھی اٹھا اپنی نقاب" کا شب و روز ورد کیا کرتے تھے کہاں اب فرماتے ہیں۔

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کی غبار راہ سے شرمندہ ہے

اقبال کے عشق کا ارتقا بھی ان کے کلام سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے چنانچہ پہلے وہ اس جذبہ عشق کے اکتساب کی خاطر دید حسن چاہتے ہیں ع "حسن عشق انگیز ہر شئے میں نظر آئے مجھے" پھر اس کے بعد عشق کی بدولت حیات ابدی پانے کے آرزو مند ہیں۔

خاک میں ملکے حیات ابدی پاجاؤں
عشق کا سوز زمانہ کو دکھاتا جاؤں

یہاں تک کہ اس جذبہ کا احساس ان کی حالت میں ایک تغیر پیدا کر دیتا ہے۔

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشت خاک ایسی نہاں زیر قبا رکھتا ہوں میں

تا آنکہ وہ لذت قرب حقیقی کی خاطر بے چین نظر آتے ہیں۔ ع۔ لذت قرب حقیقی پہ مٹا جاتا ہوں میں۔ اور

اتنے پر بھی ان کے احساس عشق کی حکایت ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ جذبہ روز بروز دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا جاتا ہے۔ اور جلد ہی عاشق پر وہ حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اور حسن کے وجود میں امتیاز تک نہیں کر سکتا۔

انجمن حسن کی ہے تو تری تصویر ہوں میں عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

ایسی حالت میں وہ ناز و نیاز کی دنیا سے دور اپنی دنیا آباد کرتا ہے وہ فنافی اللہ ہو جاتا ہے اور منتہائے عشق پر پہنچ کر نعرہ سرمدی زبان پر لاتا ہے۔

صیاد آپ حلقہ دام ستم بھی آپ بام حرم بھی طائر بام حرم بھی آپ

مگر کیا منصور کا واقعہ اس کے پیش نظر نہیں، کیا وہ اصحاب نکتہ چیں کی محفل کی زینت نہیں ان باتوں کا فراموش کرنا اس کے دائرہ امکان سے باہر ہے۔ چنانچہ جہاں وہ ایک شعر میں "ہم کو زہ و ہم کو زہ گر و ہم گل کوزہ" کے مضمون کو ادا کرتا ہے وہاں دوسرا شعر اپنے پہلے خیال کی تردید میں نظم کرتا ہے اور محض انجام بنکر۔

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

کہتا ہوا نظر آتا ہے ظاہر ہے کہ وہ اس راز سے جو اسکی چشم مظاہر پرست کے کھلنے کے بعد اور چشم دیدار طلب نے جذبہ عشق کے زیر اثر معلوم کیا ہے کسی کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔

ہاں آشنائے لب نہ ہو راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

اور وہ محض جان کے ڈر سے ہی اس راز کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ راز کو پوشیدہ رکھنے کی ممکنہ مساعی کا باعث زیادہ تر یہ خیال ہے کہ

ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے
یہ دور نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ
پنہاں دروں سینہ کہیں راز ہو ترا
اشک جگر گداز نہ غماز ہو ترا

انہیں اس جہاں فانی میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو ان کے درد سے آگاہ ہو۔

یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے جو زیر چرخ کہن نہیں ہے

اور وہ خود کسی نااہل پر اس راز کو منکشف کرنا نہیں چاہتے کیونکہ

نہ ہو طبعیت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو کا

اور جو ہر قابل کے معدوم ہونے کی وجہ سے ہی وہ دوسرے اشخاص سے بھی جو اس درد سے آگاہ ہوں خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہیں اور اسی خاموشی ہی کو اپنے اور دوسروں کے حق میں مفید تصور کرتے ہیں۔

بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں

اور اسی لئے وہ آج کل کے نام نہاد زاہدوں اور صوفیوں سے بھی کہ جن کے گرد ہر وقت ایک جم غفیر موجود رہتا ہے ناراض ہیں کیونکہ ان کے خیال میں محبت والے کی کوئی انجمن نہیں۔

ملا محبت کا سوز مجھکو تو بولے صبح ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو تری کوئی انجمن نہیں ہے

لیکن دیدہ بینا پر یہ خوبی روشن ہو جاتا ہے کہ حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں ہی تخلیق عالم کا باعث ہیں۔ ع۔ بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو۔ خود حسن کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اگر عشق نہ ہوتا تو ارض و سما بھی نہ ہوتے اگر ذات حبیب نہ ہوتی تو خدا کا ظہور ہوتا نہ جن و بشر ہوتے محبوب خدا کا ظہور باعث ظہور عالم اور آپ کا نور باعث وجود عالم ہے جس نے روز اول ہی کی تعلیم دیکر خلقت کو اس راز سے آگاہ کیا۔

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق
آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

اور انسان ضعیف البنیان نے بھی رضائے خدا کو پہچان کر "یہ سب کچھ ہوں مگر ہستی مری مقصد ہی قدرت کا اس جذبہ کو اپنے دل میں آباد کیا پھر تو جہاں دنیا میں ایک طرف حسن عشق انگیز کی فسوں سازی نظر آئی۔

حسن ازل کہ پردہ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بیقرار ہے جلوہ عام کے لئے

تو دوسری جانب عشق وارفتہ حسن کا سوز ہے۔

سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کا ندیوں کو عشق
موجہ بحر کو تپش ماہ تمام کے لئے

حسن سے مراد وہ حسن نہیں کہ جس کا ظہور کسی خاص شئے کے ساتھ وابستہ ہے بلکہ وہ جس کے واسطے بحر و بر جہاں کا دامن تنگ ہے جس کے واسطے مینائے پہنائے عالم بھی چھوٹا ہے جس کی مئے جام فلک اور ساغر کون و مکان میں بھی نہیں سما سکتی وہ سمندروں کے عمق سے بھی زیادہ گہرا ہے سر بفلک پہاڑوں کی اونچائی سے زیادہ بلند ہے زمین و آسمان کا طول و عرض جس کا احاطہ نہیں کر سکتا پیمانہ حیات کا وقت بھی جس کو پابند

نہیں بنا سکتا غرض وہ حسن عالمگیر کہ جس کو ابعاد اربعہ بھی محدود نہیں کر سکتے ۔ اور عشق وہ نایاب اور لاثانی د یگانہ کہ جس کے آگے بقول اقبال ۔

۱ چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
۴ حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
۲ اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
۵ ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
۳ تڑپ بجلی سے مانگی حور سے پاکیزگی پائی
۶ ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے

اور دنیا کی ہر شئے میں موجود ہے ۔

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ
چشم نظارہ میں نہ تو سرمہ امتیاز دے
عشق بلند بال ہے رسم و رہ نیاز سے
حسن ہے مست ناز اگر تو بھی جواب ناز دے

ان دونوں کا رشتہ تعلق بھی ہمیشہ کے لئے غیر منقطع ہے کیونکہ

تو جو محفل ہے تو ہنگامہ محفل ہوں میں
حسن کی برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک میں شبنم تیری
شام غربت ہوں اگر میں تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے
تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے

اور حسن و عشق کا باہم تعلق ہی نظام عالم کو برقرار رکھے ہوئے ہے ۔

غم خانہ جہاں میں جو تیری ضیا نہو
اس تفتہ دل کا نخل تمنا ہرا نہو

اسی کے باعث تمامی کائنات زیست لئے ہوئے ہے اسی کی بدولت ۔

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

اور اسی کے باعث مخلوق کو آسودگی و راحت حاصل ہے۔

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے، صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے
مرض کہتے ہیں سب اسکو یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاج گردش چرخ کہن بھی ہے

عشق مائل بہ حسن ہو کر۔

کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ
کشش تیری اے ذوق بیدار کیا تھی

ہر شئے میں حسن کا مشاہدہ کرتا ہے۔

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

اور حسن گلشن عشق کی بہار ہے۔

ہے مرے باغ سخن کے لئے تو باد بہار
میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار

اور فطرت عشق کو تحریک کمال عطا کرنے والا ہے۔

حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کی نہال

لیکن بقائے حسن کی جہت اصلی بقائے عشق ہے ع ہے
بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی۔ اور یہ تمام کائنات بھی عشق اور
حسن کی ہم آہنگی کے باعث ہی جامہ ، زیست پہنے ہوئے ہے اور یہ راز

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

سکندر علی وجد

اقبال کی غزلیں

یہ صحیح ہے کہ اقبال کی غزلیں اس کی نظموں سے پست ہیں لیکن اس خیال کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں سے غزل کے میدان میں پیچھے ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ گنتی کی چند غزلوں کے باوجود اقبال نے جو ٹھیٹھ تغزل پیش کیا ہے اس کا جواب بہت سارے صاحب دیوان یعنی پیشہ وار غزل گو شعرا بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

حالی کی شہرت کا باعث اس کی مسدس ہوئی لیکن اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ غزل کے میدان میں بھی اس نے سیکڑوں غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں جن پر اردو ادب جتنا ناز کرے بجا ہے۔ یہی حال اقبال کا بھی ہوا کہ اس کے اعلیٰ پایہ نظموں کے آگے اس کی غزلیں زیادہ چمک نہ سکیں لیکن جب انہیں کو اس کے ہمعصروں کی غزلوں کے مقابل رکھا جاتا ہے تو یہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمک اٹھتی ہیں۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اقبال اپنی فلسفیانہ ذہنیت کے سبب غزل میں جیسا چاہیئے ویسا سوز و گداز پیدا نہیں کر سکتا اور قومی شاعری کے رجحان کے باعث واردات حسن و عشق کے بیان پر پوری قدرت نہیں رکھتا۔ دراصل اقبال فلسفی اور صوفی سے زیادہ شاعر ہے اور شاعر بھی وہ جو صرف حسن کا پجاری ہے۔ اور عشق کا سیوک۔ اقبال حسن و عشق کی ماہیت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہے چنانچہ کہتا ہے۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

جس شاعر کے تمام اعمال کی بنیاد محبت پر ہو اس کے کلام میں جس قدر سوز و گداز اور تاثیر ہو، کم ہے اقبال کی غزلیں شگفتہ، سلیس اور پر اثر ہیں۔ ان میں کہیں تو حافظ کی رند مشربی جھلکتی ہے اور کسی جگہ داغ کی زبان کا چٹخارہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ کبھی حافظ کا ہمنوا بن کر کہتا ہے کہ۔

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ!
کہ ہم تو رسم محبت کو عام کرتے ہیں

تو کسی وقت داغ کا ہمزبان ہو کر پوچھتا ہے کہ

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد

مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی !!

یا

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کا کیا تھی

حالی نے غزل کی اصلاح کی جو صدا بلند کی تھی اقبال نے اس پر لبیک کہا اور اس پر عمل بھی کر کے دکھا دیا اقبال نے غزل کے میدان کو وسیع کیا۔ غزل کی جس تنگنائی کا غالب، ہمیشہ رونا روتا رہا، اقبال نے اس کو کشادہ کیا تاکہ اس کا وسعت طلب زور بیان محدودیت نہ محسوس کرے چنانچہ اس کی غزلیں عشق و محبت، فلسفہ و حکمت اور پند و موعظت سے بھری پڑی ہیں۔ حالی کی طرح اقبال نے بھی بعض مسلسل غزلیں کہی ہیں لیکن یہ کوئی عیب نہیں۔ اگر یہ عیب ہی ہے تو اس سے بہترین غزل گو شعرا بھی نہ بچ سکے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر کہا جاتا ہے کہ اقبال کی غزلوں میں بھی "نظمیت" جھلکتی ہے۔

اگر غالب۔

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

اور

وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز ماہ و سال کہاں

جیسی مسلسل غزلیں کہہ کر بھی بہترین غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر اقبال کو محض اس لئے اس کی بعض غزلیں مسلسل ہیں، اس کو غزل گو شعرا کے زمرے ہی سے خارج کرنے والے کہاں تک حق بجانب ہیں؟

اس کے علاوہ اگر غالب اپنی فلسفہ طرازی، ذوق، اپنے اخلاقی پند و نصائح، درد اپنے تصوف اور مومن اپنے نجوم و رمل کو بھی غزل میں بیان کرنے کے باوجود غزل گو کہلا سکتے ہیں تو صرف سیاسی یا اصلاحی حالات کی بناء پر سرے سے اقبال کو غزل گوئی کے رتبہ بلند سے کیوں محروم کر دیا جاتا ہے!

اقبال کی شاعری ایک خاص مقصد کے تابع ہے۔ وہ اپنی قوم کی پستی کو بلندی سے بدلنے کی دھن میں لگا ہوا ہے اس لئے اس کی غزلوں میں بھی اس کی دلی کیفیات کا عکس آجاتا ہے اقبال کی شاعری بیکاری کا مشغلہ یا دلگی کا سامان نہیں ہے بلکہ وہ ایک پیام ہے، یہی چیز تھی جس نے اقبال کو بہت جلد غزل گوئی کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا ورنہ جس طرح آج نظم کہنے میں کوئی اس سے برتری کیا، ہمسری کا بھی دعوی نہیں کر سکتا، اسی طرح غزل گوئی میں بھی وہ امام تسلیم کیا جاتا۔ گو اقبال کے ہمہ گیر اور اعلیٰ تخیل نے اس کو غزل کی طرف زیادہ مائل ہی نہ ہونے دیا۔ لیکن اس پر بھی اس

نے جو کچھ کہا خوب کہا، اور یہی نہیں بلکہ اچھے کہنے والوں سے اچھا کہا۔

بانگ درا میں اقبال کی غزلوں کے اشعار کی کل تعداد دو سو انیس ہے۔ اگر ان میں سے انتخاب کیا جائے تو یقیناً خیالات کی کثرت، اعلیٰ تخیل اور طرز ادا کے انوکھے پن کے لحاظ سے اردو کے کسی شاعر کے اتنے ہی اشعار میں سے اس قدر اچھے شعر نہیں نکل سکتے۔

غزل کے تمام لوازمات اقبال کی غزل میں موجود ہیں۔

غالب کا ایک شعر ہے۔

تماشا کر اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اقبال اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

غالب تمنا کی مجسم تصویر بن کر اپنے محبوب سے ایک نگاہ التفات کی التجا کرتا ہے لیکن اقبال "مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں" کہہ کر پہلے اپنی عاجزی اور خاکساری (جو عاشق صادق کی خوصیات ہیں) اظہار کرتا ہے۔ وہ غالب کی طرح "تماشا کر" کہہ کر محبوب کو اپنی طرف راغب کرنے کو گستاخی سمجھتا ہے اس لئے اپنے شوق اور انتظار کی کیفیت کے ملاحظہ ہی کے لئے درخواست کر کے چپ رہ جاتا ہے۔

رند کا شعر ہے۔

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں ، میں کہاں ، کہاں صیاد

شاعر آب و دانے کی کشش کو اپنی گرفتاری کا سبب بتاتا ہے۔ لیکن اقبال اپنی گرفتاری کی کیا ہی انوکھی وجہ بتاتا ہے۔

پاس تھا ناکامی صیاد کا اے ہمصفیر
ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کے لئے

ہم اپنی آنکھوں سے دنیا کی چیزوں کی سطحی طور پر دیکھتے ہیں۔ ہماری بینائی کی رسائی مادی اشیاء تک محدود ہے، اگر اس کے علاوہ ہم غیر مادی چیزوں یا ان کی حقیقت کو دیکھنا چاہیں تو ہمیں اپنی باطنی آنکھوں کی بینائی درکار ہوگی۔ اس خیال کو درد دہلوی نے ایک رباعی میں ادا کیا ہے۔

اے درد ! بہت کیا پر یکھا ہم نے
دیکھا ہے یہی جہاں کا لیکھا ہم نے

جب آنکھ نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ
جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے

اقبال نے اسی مفہوم کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کے نہ دیکھا کرے کوئی

بیدل عظیم آبادی کا مشہور شعر ہے۔

باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کی شدہ بے جنوں مباش !

اقبال نے اسی خیال کو کس شگفتہ اور سلیس طریقہ سے اور کتنی ترقی کے ساتھ کیا ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے !

میر کا ایک بے مثل شعر ہے۔

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا !

اقبال کا یہ شعر

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

بھی میر کے شعر کے مفہوم کے لگ بھگ پہنچ جاتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں فرصت زندگی بقدر یک تبسم اور یہاں وہ گریہ غم ہے۔

عاشق اپنے محبوب کا نام لے لے کر چیختا پھرتا ہے یہاں تک کہ شدت ضعف سے اس میں اپنے محبوب کی آواز پر "لبیک"! کہنے کی بھی سکت باقی نہیں رہتی کیونکہ وہ اپنی تمام قوت پکارنے میں صرف کر چکتا ہے اگر اس میں "لبیک"! کہنے کی طاقت ہی باقی رہتی تو وہ ایک مرتبہ اور اپنے محبوب کو نہ پکار لیتا اس خیال کو اقبال یوں ادا کرتا ہے۔

صدائے لنترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ آفت کے مارے میں

جوش اپنی نظم میں کہتا ہے

صدا یہ دے رہا ہے طور سے کون
کوئی کہدو مجھے فرصت نہیں ہے

ان دونوں شعروں کے مقابلے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوش کا انداز بیان رندانہ ہے اور اقبال کا عاشقانہ۔

غالب کا شعر ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اقبال اسی خیال کو کتنی ترقی سے پیش کرتا ہے۔

غرض نشاط ہے، شغل شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

اقبال اور غالب شغل مے نوشی سے "نشاط" کی غرض کو قطعی ناجائز سمجھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال کا انداز بیان زیادہ قائل کرنے والا اور مدلل ہے کیونکہ وہ حصول نشاط کو حرام قرار دیتا ہے۔ غالب بھی گو "نشاط" کو جائز نہیں سمجھتا تاہم اک گونہ بیخودی کو روا رکھتا ہے (اور یہ خود بھی نشاط کی ایک شکل ہے)

میر کا ایک اخلاقی شعر ہے۔

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کار گاہ ساری دوکان شیشہ گر ہے۔

اقبال انسان کو دنیا میں اس سے بھی زیادہ محتاط زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چلی
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

"دوکان شیشہ گر" میں اگر انسان احتیاط سے چلے پھر تو نقصان کا بہت کم احتمال باقی رہ جاتا ہے لیکن جو شخص "میناخانہ بدوش ہو" اس کے لئے تو ادنیٰ سی لغزش پا بھی بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی۔

اقبال کی غزلوں میں جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے متقدمین کی غزلوں کی طرح بیان حسن و عشق (تغزل) پند و عظمت اور تصوف سب کچھ موجود ہے۔

تغزل

ہم اپنی درد مندی کا فسانہ
سنا کرتے ہیں اپنے راز داں سے
میرے ملنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں میرا ان کا سامنا کیونکر ہوا
میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندی رسم فغاں تک ہے

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے
مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مئے ہے جس رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں
خموش اے دل ! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا ، کہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الہیٰ تیرا جہاں کیا ہے ! نگار خانہ ہے آرزو کا !!!
یہ رسم بزم فنا ہے اے دل ! گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بیقرار ہوگا
آہ ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامہ خاموش ہے

پندو موعظت

اس گلستان میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر
اے رہرو فرزانہ ! رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو ، صحرا ہے تو طوفان ہو
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم

اپنی ہستی سے عیاں شعلہ سینائی کر
پہلے خوددار تو مانند سکندر ہولے
پھر جہاں میں ہوس شوکت وارائی کر

نہیں ہے غیراز نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپائیدار ہوگا
بھلی ہے ہم نفسو ! اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں
نہ ہو طبعیت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سر سبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو کا
شبنم کی طرح پھولوں پہ رہ اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے
لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں درد عشق
بسمل نہیں ہے تو تو تڑپنا بھی چھوڑ دے
گلذار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ !
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ !

تصوف

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ
کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھکو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا
حسن کامل ہی نہ ہو اس حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خودنما کیونکر ہوا
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی
اگر کچھ آشنا ہوتا مذاق جبہ سائی سے
تو سنگ آستان کعبہ جا ملتا جبینوں سے

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں !
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں
مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے ساز کرے
تمیز لالہ و گل سے ہے نالہ بلبل !
جہاں میں وانہ کوئی چشم امتیاز کرے
بزم ہستی اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
تو تو ایک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرد میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

یہ چند اشعار اقبال کی استادی (بحیثیت غزل گو) کی دستاویز ہیں جن پر زمانہ حیات دوام کی مہریں ثبت کر چکا ہے ۔ زمانہ کا معیار صحیح اور فیصلہ اٹل ہے وہ کتنا لکھا"! نہیں پوچھتا بلکہ جانچتا ہے کہ "کیسا لکھا"

سکندر علی وجد

"بال جبریل"

اقبال کا کلام مردہ قوموں کے جمود و سکون کو توڑنے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے شعروں کے پڑھنے سے رگوں میں بجائے خون کے زندگی بجلیوں کی طرح کوندنے لگتی ہے اسی باعث اقبال کا موجودہ دنیا کے بہترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔

اقبال کی تازہ تصنیف "بال جبریل" درحقیقت اس کے نظریوں کی تکمیل اس کے معتقدات و خیالات کی معراج اور اس کے مسلک کا نہایت صحیح عکس ہے

"بانگ درا" کے مطالعہ سے اقبال کی غیر معمولی قوت متخیلہ بے نظیر روانی طبع اور جوش، لاجواب اپج اور لاثانی استعداد شاعری کا حال معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں وہ سوز و گداز نہیں پایا جاتا جو "بال جبریل" کا طرہ امتیاز ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبال نے ابھی اپنا کوئی خاص نصب العین قرار نہیں دیا تھا وہ ہنوز اپنی اور کائنات کی اہمیت و اصلیت سے پوری طرح واقف نہ تھا، اسی لئے صبح کا سماں، شام کی کیفیت، گور غریباں کا منظر، آب جو کا نظارہ اور اسی قبیل کی دوسری کیفتیں اس کے حساس دل کو بہت زیادہ متاثر کرتی تھیں۔ چونکہ اس نے ابھی اپنی منزل مقصود مقرر نہیں کی تھی۔ اس لئے وہ ہر نقش قدم پر سجدے کرتا اور ہر نغمے پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اس دور میں وہ رہنما اور رہزن میں کم فرق کر سکتا تھا۔ اس کی نظروں میں ابھی تک "خودی" کے جلوے نہیں سمائے تھے اس لئے وہ اس کی بے پناہ قوت سے باخبر نہ تھا۔ بانگ درا بیشک اقبال کی شاعری کے شباب کا مرقع ہے لیکن اس میں رنگینی، جوش اور زور کے ساتھ کہیں کہیں جوانی کی بے راہ روی اور ناتجربہ کاری بھی جھلکتی ہے۔ بانگ درا میں اقبال ایک ڈھونڈنے والے کی طرح بے چین ہے اور بال جبریل میں وہ ایک پانے والے کے مانند مطمئن۔ بانگ درا زیادہ تر رنگ ہے اور "بال جبریل" تمام تر رس۔

اب اقبال خود آگاہ بھی ہے اور خدا آگاہ بھی۔ وہ مسلسل جد و جہد کے بعد، ٹھوکریں کھا کھا کر منزل مقصود پر پہنچ چکا ہے اور دوسروں کو بھی اسی طرح چیخ چیخ کر بلا رہا ہے۔ راستے کے خطروں سے سب کو خبردار کر رہا ہے اور ان کی سچی رہنمائی کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ اس کے نزدیک منزل مقصود تک صحیح سلامت پہنچنے کے لئے "احساس خودی اور سخت کوشی۔ از بس ضروری ہیں اور اقبال کے پیام کے یہی دو اہم اجزاء ہیں

آج اقبال ایک شاعر اور مصلح کی صورت میں نہیں بلکہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے اپنے صحیفہ "بال

جبریل " کے ذریعہ اہل عالم کو پیام زندگی سنا رہا ہے ۔ اب اس کی ہر بات تجربے پر مبنی ہے ۔ سوسائٹی کے امراض کے استیصال کے لئے وہ اپنے آزمودہ نسخے تجویز کرتا ہے ۔ چونکہ اب اس کا انداز بیان نہایت ہی یقین انگیز اور مدلل ہے ۔ اس لئے وہ اپنے نظریوں کی بالکل آزادانہ تبلیغ کر رہا ہے ۔ ایک سچے آدمی کی طرح اب اس کا طرز کلام صاف، پر جوش اور بے باکانہ ہے ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ " بال جبریل " میں بانگ درا کا سا جوش اور رنگینی اور تنوع نہیں ہے یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے ۔ لیکن بیان کی سلاست ، پیام کی ہم آہنگی ، اخلاقی اور حکیمانہ مضامین اور طرز ادا کی بیباکی کے لحاظ سے بال جبریل کو بانگ درا پر فوقیت حاصل ہے ۔

بال جبریل کے بیشتر اشعار **من عرف نفسه فقد عرف ربه** اور **لیس للانسان الا ماسعی** انھیں دو نظریوں کی تشریح اور تفسیر ہیں بر خلاف اس کے ، بانگ درا میں شاعر نے کوئی مستقل پیام اس زور و شور کیساتھ نہیں پیش کیا ۔ یہ سچ ہے کہ بانگ درا کے چند نغمے انسان کو آپے سے باہر کر دیتے ہیں لیکن بال جبریل کی بعض جنبشیں چشم زن میں انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں ۔ بانگ درا کے اکثر شعروں کے پڑھنے سے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور منہ سے بے اختیار واہ! یا آہ! نکل جاتی ہے لیکن بال جبریل کے اشعار سے قلب پر ایسی کاری ضرب پڑتی ہے کہ انسان میں پھر آہ بھرنے یا واہ کرنے کی سکت ہی باقی نہیں رہتی ۔ بانگ درا میں ایک پہاڑی ندی کا سا زور شور پایا جاتا ہے ۔ اور بال جبریل میں ایک میدانی دریا کی وسعت ، گہرائی اور سنجیدگی نظر آتی ہے ۔

تعمیری خودی ۔

اقبال نے تعمیر خودی اور احساس خودداری کی بڑی پر جوش تبلیغ کی ہے ۔ اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا کسی انسان کی اہمیت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتی جب تک وہ اپنی اہمیت خود منوا نہیں لیتا ۔ اس کے نزدیک وہی لوگ دنیا میں باعزت اور باوقار ہیں جو اپنی حقیقی عزت جانتے اور اپنے جوہر کو پہچانتے ہیں ۔

زمانے میں کھوما ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں

اس خودی کے معنی " میں پن " نہیں بلکہ اس کا مفہوم خود شناسی " خودداری " ہے ۔ یہ خودی دراصل نیاز مندی کی ایک شکل ہے ۔

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں

اقبال ترک دنیا ، ترک خودی اور تن بہ تقدیر رہنے کا مطلق قائل نہیں ۔ وہ ان خیالات کی شدید مخالفت کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جب یہ عقائد کسی قوم کی فطرت میں جگہ پکڑ لیتے ہیں تو وہ قوم بہت جلد فنا ہو جاتی ہے ۔ بر خلاف اس کے جن قوموں میں " احساس خودی " ہوتا ہے وہ دنیا پر حکمرانی کرتی ہیں کیونکہ ان کو اس احساس کی بدولت ہر طرف کامیابی ہی کامیابی نظر آتی ہے اقبال ساری دنیا کو خودی کی زد میں خیال کرتا

ہے ۔ پیغمبری، ولایت اور قلندری کو وہ خودی کے مختلف مظاہر کہتا ہے۔

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی
خودی کی جلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

ایک معمولی انسان احساس خودی کی بدولت ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج حاصل کر سکتا ہے اور اس احساس کے فقدان کے باعث ایک عالی مرتبہ شخص تنزل کی ادنیٰ ترین منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

رائی زور خودی سے پربت پربت ضعف خودی سے رائی

خودی ایک بحر ناپیدا کنار ہے ۔ جس میں غرق ہو جانا ہی انسان کے حق میں عین کامیابی ہے ۔ جس شخص نے اپنی خودی کے علاوہ کسی دوسری شئے سے محبت کی یا اس کے حاصل کرنے میں سرگرم رہا حقیقت میں اس نے اپنی زندگی ضائع اور اپنی اوقات خراب کی ۔ اپنی خودی سے محبت کرنا ہی زندگی کا حقیقی مقصد ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے سب ہیچ ہے۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

مگر ساتھ ہی ساتھ اقبال یہ بھی جتا دیتا ہے کہ اس سمندر میں تیرنا کھیل نہیں ہے یہاں عالی ظرفی اور حوصلہ مندی درکار ہے۔

خودی میں ڈوبتے ہیں ، پھر ابھر بھی جاتے ہیں مگر یہ حوصلہ مرد ہیچ کا رہ نہیں

انسان کی عزت اور زندگی کا تمام تر دار و مدار "حفظ خودی" ہی پر موقوف ہے۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

موتی کے گران بہا ہونے کا راز اس کا "حفظ خودی" ہے ورنہ حقیقت میں وہ ایک سنگریزے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

جس انسان میں ابھرنے اور ترقی کرنے کی خواہش نہیں اس کی حیات ، موت کے مترادف ہے ، اس لئے کہ زندگی نام ہے ایک کشمکش مسلسل اور سعی پیہم کا۔ کائنات کا ہر ذرہ حرکت ہی کے سبب سے زندہ ہے یہی اضطرار اس کی زندگی کی دلیل اور اس کی حیات کا عین مقصد ہے۔

بے ذوق نمود زندگی موت تعمیر خودی میں ہے خدائی

خودی کے مسلک کو اختیار کرنے کے بعد سالک کو راستے کے سیمیائی جلووں کو دیکھ کر ٹھٹھک نہ جانا چاہیئے بلکہ اس کی نظر میں وسعت اور خیالات میں رفعت ہونی چاہیئے ۔ خودی کا اعلیٰ ترین زینہ وہ ہے جہاں پہنچنے کے بعد "بے طلب عطا" کی نوبت آتی ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کے ہتھیار کی دھاک سے انسان ساری دنیا کو اپنے قبضے میں لاسکتا ہے۔ خودی اسرار الہیٰ کے مخفی خزانوں کی کنجی ہے۔

خودی کے زور سے دنیا یہ چھا جا! مقام رنگ و بو کا راز پا جا!

لیکن سارے عالم کو مطیع کر کے اور یہاں کے تمام رازوں سے واقف ہونیکے بعد اگر انسان یہیں کے جھمیلوں میں پھنس جائے اور اسی کو اپنا مقصد زندگی سمجھنے لگے تو یہ سخت غلطی ہے۔ بلکہ دسترس حاصل ہونے پر بھی اسے گزشتی و گزاشتنی ہی سمجھے ورنہ مقصد حیات فوت ہو جائے گا۔

برنگ بحر ساحل آشنا رہ! کف ساحل سے دامن کھینچتا جا!

ساز خودی کا نغمہ حیات ابدی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو قومیں احساس خودی کی آگ میں جل رہی ہیں انہیں کا نام روشن ہے۔

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

خود دار ادنی بے عزتی کی حیات جاوداں پر عزت کی مرگ ناگہاں کو ترجیح دیتا ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب وہ نان جس سے جاتی رہے اسکی آب

وہ سخت سے سخت محنت و مشقت تو کر سکتا ہے لیکن اپنا سر کسی کے آگے جھکا نہیں سکتا۔

وہی نان ہے اس کے لئے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

سخت کوشی

اقبال اس راز سے خواب واقف ہے سخت کوشی اور جفاکشی کے بغیر کوئی قوم دنیا میں پنپ نہیں سکتی کاہلی مہاروگ ہے۔ یہ مہلک مرض سوسائٹی کے تمام قوائے عملیہ کو معطل کر دیتا ہے۔ اچانک مصیبتوں اور ناگہانی آفتوں سے جو لوگ پست ہمت ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ بے عزتی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اقبال اس امر پر بہت زور دیتا ہے کہ سختیاں اور تلخیاں زندگی میں حقیقی لطف پیدا کر دیتی ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے۔

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست گفتا مئے کہ تلخ تر او نکو تر است

اسی تصور کو بال جبریل میں اس نے نہایت شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہی لوگوں کے سامنے دنیا کی ساری سرکش قوتیں سر جھکا دیتی ہیں جن کے ارادے لوہے کی طرح مضبوط اور پہاڑ کے سے اٹل ہوتے ہیں۔ یہ اہل ہمت طوفان حوادث کی ہیبتناک موجوں سے کھیلتے ہیں۔ ان کی زندگی اس خطرناک کھیل میں بسر ہو جاتی ہے۔ زمانے سے ڈرنا بزدلوں کا کام ہے بہادر اس سے لڑ کر اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز!

مخلصانہ جستجو اور مردانہ وار اقدام کی بدولت انسان بغیر کسی امداد کے اپنے مقصد میں نہایت آسانی کے ساتھ کامیاب ہو سکتا ہے۔

چیتے کا جگر چاہیئے شاہین کا تجسس جی سکتے ہیں بے روشنی دانش افرنگ

حقیقی انسان بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ہمت نہیں ہارتا۔ اس کا مضبوط ارادہ کبھی اسے اپنے مطمح نظر کے خلاف کوئی کام کرنے نہیں دیتا وہ صعوبتوں سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور مصیبتیں جھیلنے اور تکلیفیں سہنے کے لئے سدا تیار رہتا ہے۔ کاہلی کفران نعمت ہے۔ خدا نے ہم کو طاقت، ہمت اور عقل جیسی بے بہا نعمتیں عطا کی ہیں اگر ہم ان کا استعمال نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم عطیہ الٰہی فضول سمجھتے ہیں جفاکش انسان بیچ سمندر کی موج کے مانند پیچ و تاب کھا کھا کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتا ہے وہ ساحل سے قطعی ناآشنا رہتا ہے کیونکہ یہ مقام آسائش ہے اور آرام عمل کی موت ہے۔

ظلام بحر میں کھو کر سنبھل جا
تڑپ جا پیچ کھا کھا کر نکل جا!
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا!

انسان جس کام کے کرنے کا مستقل ارادہ کرلے وہ ضرور حسب و خواہ انجام پاتا ہے لیکن مسلسل محنت شرط ہے۔ جفاکشی انسان کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے انسان کی پوشیدہ قوتیں ظہور میں آتی ہیں اور وہ بڑے بڑے کام کر جاتا ہے۔

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر!

موجودہ تعلیم

روح کی پیاس بجھانے کا سامان مشرق و مغرب دونوں کے پاس نہیں ہے۔ موجودہ طریقہ تعلیم نہایت ناقص ہے۔ اقبال اس علم تہی پر جہل کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ جس طلب کی بنیاد عشق پر ہوگی وہ پوری ہوگی اور جس کی بنیاد ہوس پر ہوگی اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ موجودہ علم کی بنیاد ہوس پر ہے۔ کسی طالب علم کو علم سے عشق نہیں ہے اور یہی سبب ہے۔ اس کی خامی کا بغیر عشق کے علم بے سود ہے۔

عشق کی تیغ جگردار اڑالی کس نے علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

موجودہ تعلیم سے طالب علموں میں ہمت جفاکشی، الوالعزمی اور خودداری کی صفتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ ایسی کھوکھلی عقل کے مقابلہ میں اقبال جنون ہی کو ترجیح دیتا ہے۔

عطا اسلاف کا جذب دروں کر

شریک زمرہ لا یحزنون کر !
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر !

یہ جنون ، دیوانگی یا خبط نہیں ہے بلکہ یہ دوسرا نام ہے سچی دھن اور اصلی لگن کا ، جس کے بغیر انسان کسی ہنر میں کامل نہیں ہو سکتا جو لوگ اپنے مقصد کے پیچھے دیوانے ہو جاتے ہیں وہی کچھ کر بھی جاتے ہیں ۔ ہماری یونیورسٹیوں کے طلبا اسی دھن اور لگن کی کمی کے باعث ادھورے رہ جاتے ہیں ۔

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراش آذرانہ

حقیقی علم استاد کی "نظر" سے حاصل ہوتا ہے ۔ موجودہ زمانہ کے طلبہ کی خامی کا باعث زیادہ تر ان کے "خام" اساتذہ ہیں ۔ جن کی قابلیتیں تو مسلم ہوتی ہیں لیکن خلوص جو استادی کا جزو اعظم ہے ان میں بہت کم ہی پایا جاتا ہے ۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

انہیں نقلی استادوں کے ہاتھوں ہماری نئی پود بے عمل اور ناکارہ بن رہی ہے ۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہی بچوں کو دے رہے خاکبازی کا

موجودہ طریقہ تعلیم سے طلبا میں اخلاقی جرات اور بیباکی مطلق پیدا نہیں ہوتی ان کے ارادے کمزور اور خیالات پست ہو جاتے ہیں ۔ خدا کے سوا وہ ہر چیز کے آگے اپنا سر نیاز خم کرتے اور آزادی جیسی لاقیمت شئے کو در بدر کوڑی کے مول بیچتے پھرتے ہیں ۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

تہذیب حاضر

اقبال مغربی تہذیب و تمدن سے بھی اتنا ہی واقف ہے جتنا کہ مشرقی تہذیب و تمدن سے ۔ اس نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں وہاں کے حالات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ۔ وہ مغرب و مشرق دونوں کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ وہ مغرب کی کمزوریوں سے بھی باخبر ہے اور مشرق کی خامیوں سے بھی آگاہی رکھتا ہے ۔ ایک جگہ اس نے مشرق و مغرب کے فرق کو یوں بیان کیا ہے ۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اسی باعث اقبال موجودہ مشرق و مغرب دونوں سے خفا ہے۔ وہ حرم و کلیسا دونوں میں یکساں مکاری کا بازار گرم پاتا ہے۔ اس لئے اپنے "جنون" ہی کی خیر منانے میں مست ہے۔

رہ و رسم حرم نا محرمانہ
کلیسا کی ادا سودا گرانہ
غنیمت ہے میرا پیراہن چاک
نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

اہل یورپ نے اپنی تمام قوتوں کو عقل کا ماتحت بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرتاپا عمل بنگئے۔ اہل مشرق نے اپنے ہر کام میں دل کو رہنما بنایا توکل اور قناعت اختیار کی اس کا اثر یہ ہوا کہ انکی عملی قوتیں کمزور پڑ گئیں۔ اب حالت یہ ہے کہ یورپ کا آدمی ایک مشین ہے اور مشرق کا آدمی ایک مردہ۔ حقیقی انسانی روح دونوں میں باقی نہیں رہی اس لئے اقبال کی یہ کوشش ہے کہ مشرق والے عملی آدمی بنیں اور مغرب والے روحانی۔ اس امتزاج ہی میں زندگی کا حقیقی لطف پوشیدہ ہے۔ مغرب کی عقل اور مشرق کا دل دونوں ملکر حیات انسانی کو نہایت ہی پر امن بنا سکتے ہیں۔ اقبال بار بار کہتا ہے کہ "نہ ابلہ مسجد" بنو اور نہ "تہذیب کی فرزندی" قبول کرو۔ افراط و تفریط سے ہر صورت میں برے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

یورپ کی بھڑک دار تہذیب اور چمکدار معاشرت میں بظاہر بہت زیادہ کشش اور جاذبیت نظر آتی ہے اس لئے وہاں پہلے انسان سوسائٹی ہی کے اثرات کی نشہ میں سرشار ہو جاتا ہے لیکن جب اسکی برائیاں اور کمزوریاں رفتہ رفتہ اس ظاہر پر ہوتی ہیں تو وہ اس ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے یورپ کی سوسائٹی اپنے اندر انواع و اقسام کے نشہ رکھتی ہے جن کا اثر وہاں کی شراب کے نشہ سے بھی دیرپا ہوتا ہے۔

میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

اہل یورپ نے اپنی عقل کو اپنے اوپر پوری پوری طرح مسلط کر لیا ہے حتی کہ ان کے دل بھی ان کی عقل کے غلام بن گئے ہیں اس سے ان کی زندگی میں وہ لچک اور لوچ باقی نہیں رہا جس سے زندگی عبارت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دماغ روشن اور دل تیرہ ہو کے رہ گئے اگر مغرب کا چندے یہی حال رہا تو ان کی تہذیب کا عنقریب پارہ پارہ ہو جانا یقینی ہے۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

اہل مغرب نے بجلی کو اپنے قبضے میں لالیا ہے سمندر کے سینے پر جہاز چلا رہے ہیں اور ہوا پر طیارے اڑا رہے ہیں لیکن یہ ترقیاں ان کو تباہی سے بچا نہیں سکتیں بلکہ یہی ایجادیں ایک دن ان کی بربادی کا باعث ہوں گی۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو

اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

مشرق اپنی قدیم روایتوں کو نہایت تیزی کے ساتھ ترک کر رہا ہے۔ اندھی تقلید جس سے انسان کے ذاتی کمال کی سوتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جاتی ہیں۔ اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب خانقاہوں اور مدرسوں سے "اہل دل" اور اہل نظر" نہیں نکلتے مدرسے کھلونا سازی کے بڑے بڑے کارخانہ ہیں جہاں سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں چمکدار رنگ لیکن ناپائدار نقلی انسان بنکر نکلتے ہیں جو زندگی کے سیلاب میں تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں مار کر ہمیشہ کے لئے ڈوب جاتے ہیں اب رہی خانقاہیں تو ان کا یہ حال ہے۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

فطرت کی ستم ظریفی اور قوم کی بد قسمتی دیکھئے کہ انہیں کے ہاتھوں میں اس کی باگ ہے۔ رہزنوں سے رہنمائی کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ انہیں کی شان میں اقبال کہتا ہے۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغون کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

رازِ زندگی

اقبال کا عقیدہ ہے کہ حرکت زندگی ہے اور سکون موت آج دنیا میں جو قومیں ترقی یافتہ کہلاتی ہیں وہ تگ و دو ہی کے باعث اس رتبہ کو پہنچی ہیں۔ بغیر سعی پیہم کے کسی کو کمال نصیب نہیں ہو سکتا۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

انسان اگر خوب سے خوب تر بننے کی فکر نہ کرے تو لازمی طور پر ایک وقت ایسا آئیگا کہ وہ خوب بھی باقی نہیں رہیگا اس لئے خواہ کتنا ہی کمال حاصل ہو جائے اس کو کم سمجھنا اور انتہائی مدارج تک رسائی حاصل کر نا ہی زندگی ہے۔ قناعت اور توکل (کے غلط تصور) سے حیات انسانی کو ایک قسم کا گھن لگ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ انسان کے جذبات بالکل مردہ ہو جاتے ہیں۔

ناصبوری ہے زندگی دل کی آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

کشمکش اور سخت کوشی ہی پر زندہ قوموں کی حیات کا دار و مدار ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

ایک مقام پر پہنچ کے بعد دوسری منزل کی طرف قدم اٹھانے چاہئیں اور وہاں پہنچ کر تیسری جگہ جانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اسی لاانتہا ذوق سفر میں راز زندگی پوشیدہ ہے۔

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

دھن اگر پکی اور طلب صادق ہے تو مشکل سے مشکل کام میں مزہ آنے لگتا ہے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

لوگوں کا خیال کہ زندگی اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا بالکل غلط ہے جن کے بازوؤں میں قوت اور دلوں میں جوش، ہمت ہے ان کے نزدیک یہ ایک معمولی کھیل ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوق پرواز ہے زندگی

جسکے بازو کمزور ہیں اور جن کے دلوں میں ذوق پرواز نہیں ہے ان کے لئے زندگی ہمیشہ ایک چیستان اور ایک راز بنی رہے گی۔ اقبال کے نزدیک کمزوری ناقابل معافی جرم ہے وہ اس کے لئے مرگ مفاجات کی سزا تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں کمزوروں کو جینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ قوی ہمیشہ سے کمزور کو فنا کرتا آیا ہے اس میں نہ قوی کا کوئی قصور ہے نہ فطرت کا کوئی ظلم۔ جو بقا کے خواہاں ہیں انہیں قوی بننے کی کوشش کرنی چاہئیے ورنہ ان کو اپنے سے زیادہ قوت والوں کے منہ کا نوالہ بننا پڑیگا۔

اقبال سیرت کی بلندی اور مضبوطی پر بہت زور دیتا ہے۔ اعلیٰ سیرت والوں کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتیں ہاتھ ٹیک دیتی ہیں۔ کردار کی بلندی سے انسان صرف زندگی کے بھیدوں ہی سے واقف نہیں ہوتا بلکہ اس پر تقدیر کے راز بھی منکشف ہونے لگتے ہیں۔ جو مردان حق اعلیٰ سیرتوں کے حامل ہوتے ہیں، فطرت کی تمام قوتیں انہیں کا ساتھ دیتی ہیں۔

صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

عشق حقیقی

اقبال عشق کو دنیا کی سب سے بڑی قوت اور حیات انسانی کی سب سے اہم ضرورت خیال کرتا ہے بغیر عشق کے انسان کی زندگی کا حقیقی لطف آہی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کو یہ پیام دیتا ہے۔

دریا عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

جو لوگ اپنے اعمال کی بنیاد عشق پر رکھتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں اس لئے عشق ایسا رہنما ہے جو رہرو کو ٹھیک نشان دادہ منزل پر پہنچا دیتا ہے لیکن عقل رہرو کے بیان پر جرح کرتی اور اسے چوں و چرا کے جھمیلوں میں پھنسا دیتی ہے۔ اس لئے اقبال کہتا ہے عقل کو تنقید سے فرصت نہیں۔ عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ۔ عشق لافانی ہے اور اس کی قوتیں لامحدود۔ یہی ایک قطرہ بے مایہ کو بحر بیکراں سے ہم آغوش کر دیتا ہے۔ اس کی بدولت ذرہ بے مقدار آفتاب عالم تاب سے جا ملتا ہے۔ اسی کے سبب ایک معمولی انسان انا الحق کے نعرے لگاتا ہے اور رتبہ بلند کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ موت کا بے پناہ وار بھی اس نازک رشتہ کو

منقطع نہیں کر سکتا۔ زمانہ کی تیز و تند ہوا کے طوفان میں بھی شمع محبت برابر منور رہتی ہے۔ حقیقی محبت اپنے اندر ہزاروں لذتیں اور لاکھوں کیفتیں پوشیدہ رکھتی ہے۔ جو محبت انقلابات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے وہ دراصل بوالہوسی ہے جس میں نہ پائداری ہے اور نہ لطف۔ وہ عشق ہی نہیں جو اسی زندگی کے ساتھ ختم ہو جائے۔

وہ عشق جس کی شمع بجھادے اجل کی پھونک　　اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا

عاشق صادق کے نزدیک حشر و نشر کوئی چیز نہیں۔ فراق دوست کے ہر لمحے میں اس پر سینکڑوں قیامتیں گزر جاتی ہیں اس کے اپنے محبوب کی ایک گردش چشم میں بیسیوں حشر دکھائی دیتے ہیں۔

کسے خبر ہے کہ ہنگامہ نشور ہے کیا　　تیری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز

اقبال عشق کو ایمان کا سب سے اہم جزو خیال کرتا ہے بغیر عشق کے کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ کر نہیں سکتا۔

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مرد مسلمان بھی کافر و زندیق

عاشق اپنے محبوب کے ظلم و ستم کو عین لطف و کرم سمجھتا ہے۔

نخچیر محبت کا قصہ نہیں طولانی　　لطف خلش پیکاں آسودگی فتراک

بیان محبت خواہ کسی زبان میں ہو، شیریں معلوم ہوتا ہے۔ پریم کا رس ہر بول میں مٹھاس پیدا کر دیتا ہے۔

ترکی بھی شریں تازی بھی شریں　　حرف محبت، ترکی نہ تازی

حیات انسانی کی رنگینی اور لطف کا تمام تر انحصار محبت پر ہے اگر یہ مقدس جذبہ فطرت انسانی سے الگ کر دیا جائے تو وہ بہائم سے بھی بدترین بن جائیگا۔

عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات　　عشق ہے نور حیات عشق ہے نار حیات

عاشق صادق کی پر درد آہیں اور جانسوز نالے کبھی رائیگاں نہیں جاتے بلکہ عالم بالا سے وہ ضرور ایک دن تاثیر بدامن واپس ہوتے ہیں اور دل عاشق کے لئے مرہم ثابت ہوتے ہیں۔ ابتدا میں بیشک عاشق کی آنکھوں کے سامنے پردے ڈال دئے جاتے ہیں اور وہ دیدار محبوب سے محروم رہتا ہے لیکن رفتہ رفتہ عشق کی آگ ان حجابات کو جلا دیتی ہے اور عاشق راز و نیاز کی ابدی لذتوں سے سرشار ہو جاتا ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر　　کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

وصل کا تقاضہ کرنا عاشق صادق کو زیبا نہیں ہے۔ اگر کسی وقت حرف مدعا زبان پر آبھی جائے تو یہ امر اتفاقی ہے اس میں ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حسرت موہانی کا شعر ہے۔

طلب، عادت نہیں اہل رضا کی　　یہ لغزش تھی زبان مدعا کی

اقبال نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

تھا ارنی گو کلیم میں ارنی گو نہیں　　اس کو تقاضا روا مجھ پر تقاضا حرام

سچے عاشق کو ہجر میں وصل سے بھی زیادہ لطف آتا ہے وصل، عشق حقیقی کی موت ہے کیونکہ عشق

کی بنیاد پر آرزو پر ہے اور وصل کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اقبال ہی کا ایک فارسی شعر ہے۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد وصل　　چیست حیات دوام سوختن ناتمام

پروانہ جب تک شمع کا دیوانہ وار طواف کرتا ہے مجسم عشق بنا رہتا ہے لیکن جونہی شعلہ شمع کی ہم آغوشی کی ہوس میں آگے بڑھتا ہے جلکر خاک ہو جاتا ہے۔ اسی لے عشاق ہجر کی مصیبتوں کو خوشی خوشی برداشت کرتے اور وصل سے موت کی طرح ڈرتے ہیں۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

اخلاق

بال جبریل میں اقبال سب سے زیادہ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اس میں زندگی بسر کرنے کے جو طریقے بتلائے گئے ہیں وہ موجودہ حالات کا بہت گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مرتب کئے گئے ہیں اور اقتضائے وقت کے لحاظ سے نہایت موزوں و مناسب ہیں۔

غلامی کی بیماری انسان کے احساسات و جذبات کو مردہ کر کے اس کو دنیا کی تمام نعمتوں اور زندگی کی ساری خوشیوں کی لذت سے محروم کر دیتی ہیں۔

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی　　جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

آزادی کے چھنتے ہی انسان کی بصیرت مفقود ہو جاتی ہے یہی نہیں بلکہ غلامی اس کو اندھا بنا دیتی ہے جو شخص آنکھیں رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے آزادی کا گوہر بے بہا گم کر دے اس کے اندھے پن پر کون شبہ کر سکتا ہے حق تو یہ ہے کہ جو آزاد ہیں وہی بینا کہلانے کے مستحق بھی ہیں۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر　　کہ دنیا میں فقط مردان حق کی آنکھ ہے بینا

وہی لوگ دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو آج ہی کل کی فکر کر لیتے ہیں۔ وہ "چوں بہ فردا بہ رسی روزی، فردا بر سد" کے مطلق قائل نہیں ہوتے۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے　　زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

جو لوگ کہ آج ہمیں شاد کام نظر آ رہے ہیں انہوں نے سب کچھ آج ہی حاصل نہیں کر لیا بلکہ وہ "کل ہی اس "آج" کے روشن بنانیکی ترکیبیں سوچ چکے اور تدبیریں کر چکے تھے۔ ہر کام صرف اسی وقت تک مشکل نظر آتا ہے جب تک مشکل سمجھ کر اسے شروع نہ کیا جائے جہاں ایک مرتبہ ہمت کی تو۔

پھر کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا　　ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

ہمت کے آگے پربت رائی ہے اور اٹل ارادے کے سامنے زمین تو کیا آسمان بھی پیش پا افتادہ چیز ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے　　کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

غلام کا صرف جسم ہی اس کے آقا کے قبضہ میں نہیں رہتا بلکہ رفتہ رفتہ اس کے دل و دماغ پر بھی آقا کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات تو جھکا جب غیر کے آگے تو تن تیرا نہ من

جو انسان حقیقی معنوں میں خدا کا بندہ ہے وہ دراصل ساری خدائی کا مالک ہے اس لئے کہ خدا کی غلامی پادشاہی کے مترادف ہے برخلاف اس کے جو آدمی بندہ دنیا بن جاتا ہے وہ ذلیل خوار ہوتا ہے۔ ایک غلامی سے آقائی کی خلعت نصیب ہوتی ہے اور ایک غلامی سے گدائی کی لعنت طوق گردن بنتی ہے۔ اب انسان جو چاہے اپنے لئے منتخب کر لے۔

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

کسب حلال انسان کو خوددار اور دلیر بناتا ہے۔ وہ کسی کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اپنی پھٹی پرانی کمبل ہی میں اس کو قیمتی شال کا لطف آتا ہے۔ اس کی زبان دل کی سچی ترجمان ہوتی ہے اس لئے وہ اظہار حق میں کبھی پس و پیش نہیں کرتا۔ لیکن ناجائز ذرائع سے جو روزی حاصل ہوتی ہے وہ انسانوں کو بزدل خوشامدی اور کمینہ بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے حاکموں کے ہاتھ اپنی آزادی بیچ ڈالتا ہے۔ اقبال اس ذلیل زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

تصوف

تصوف اقبال کے کلام کی جان ہے۔ اس کے تصوف کے بنیادی اصول مولانائے روم کے عقائد ہیں۔ اقبال، رومی پر مٹا ہوا ہے۔ اس والہانہ عقیدت مندی ہی کا اثر ہے کہ خود اس کے کلام میں بھی رومی کی سی بیباکی اور "فاش گوئی" پیدا ہو گئی ہے۔ رومی کی طرح اقبال بھی اپنے خیال کے آگے شعر کی ظاہری خوبیوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتا وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ "میرا نور بصیرت عام کر دے" جس آگ میں وہ خود جل رہا ہے دوسروں کو بھی اسی میں جلانا چاہتا ہے۔ اس کوشش میں بعض بعض جگہ اس کا لہجہ کسی قدر تلخ بھی ہو جاتا ہے چنانچہ اس تلخی کا سبب وہ خود بتاتا ہے۔

میری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہیں

اقبال شاعری کو اظہار کمال کا ذریعہ قرار نہیں دیتا بلکہ وہ اس وسیلہ سے کائنات کے رازوں کو آشکار کرتا ہے۔

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

بال جبریل میں اقبال کا انداز حکیمانہ اور صوفیانہ سے زیادہ قلندرانہ ہے وہ اس امر کا خود اعتراف کرتا ہے

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

جو لوگ "اہل دل" اور "اہل نظر" ہیں وہ ماضی اور حال ہی کے واقعات سے باخبر نہیں ہوتے بلکہ مستقبل میں پیش آنے والے حادثات کا بھی ان کے آئینہ دل پر صاف عکس پڑتا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے　　عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

اقبال دراصل نہ قدری ہے نہ جبری بلکہ اس کا مسلک درمیانی ہے وہ اگر ایک طرف ارتکاب جرم پر انسان کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے تو دوسری طرف خدا سے بھی شرمساری کا متوقع ہے کیونکہ جرم کے ارتکاب میں صرف انسانی ارادے ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ ارادہ بھی کسی اور ارادے کے اشاروں پر کام کرتا ہے اقبال قاتل کو جہاں قصاص کا حکم سناتا ہے وہاں شمشیر ساز کو بھی تھوڑا سا جرمانہ کرتا ہے۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل　　آپ بھی شرمسار ہو، مجھکو بھی شرمسار کر

عام لوگ جلوہ خداوندی کے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتے یہہ کام خاصان خدا کا ہے جن کے قلوب انوار الہیٰ سے معمور رہتے ہیں۔ عامیوں کو نور مطلق کی ایک ہلکی سی جھلک بھی بے قابو کر دیتی ہیں اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں لیکن محرمان راز حقیقت تجلیات الہیٰ کی بارش میں بھی اطمینان قلب نہیں کھوتے

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محراب منبر پر
یہ نادان گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

منظر عام پہ آنا حسن کی فطرت ہے۔ حسن مطلق ذرے ذرے میں سمایا ہوا ہے۔ صاحب نظر اس کا ہر جگہ نظارہ کرتے ہیں۔ عام لوگوں کی بینائی ہی ان کی آنکھوں کا پردا بن جاتی ہے اور وہ جلوہ حق کی دید سے محروم رہ جاتے ہیں۔

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی کہ ان آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری

شوخی بیان

اقبال کلام میں نہ صرف غالب کی سی شوخی، بلند پروازی اور خودداری موجود ہے بلکہ اس میں عمر خیام کی سی آزاد مشربی اور بے باکی کی بھی پائی جاتی ہے۔

غلطیوں اور کمزوریوں کا پتلا، انسان خدا کا نافرمان بندہ ہی سہی لیکن حقیقت میں یہی اس ویرانہ آباد نما کی رونق اور چہل پہل کا باعث ہے۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن　　ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اس خرابے میں انسان ہی کی محنت کے طفیل مختلف نیرنگیاں، طرح طرح کی دلچسپیاں اور بھانت بھانت کی رنگ رلیاں مچ رہی ہیں۔ اسی کے دم سے اس ویرانے میں فلک بوس عمارتیں بنیں اور اس صحرا میں غیرت باغ جنت چمن تیار ہوئے۔

میری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے　　وہ دشت سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردہء رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

اسی نظم میں پہاڑی ندی کی کیا چلبلی تصویر کھینچی ہے۔

وہ جوئے کہستان اچکتی ہوئی
اٹکتی ، لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھاکر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

حقیقی مومن۔

ایک سچا مسلمان ، بندوقوں ، تلواروں ، بموں اور ہوائی جہازوں کے بل پر نہیں لڑتا بلکہ وہ اپنے دشمن پر "تائید الہیٰ" سے عروس فتح سے ہمکنار ہوتا ہے ۔ اس کے نزدیک خدا کے سوا کسی دوسری چیز پر بھروسہ کرنا کفر ہے ۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مومن حقیقی سوا خدا کے کسی دوسرے کا سہارا یا پناہ قبول نہیں کرتا اسی لئے دنیا کی تمام قوتیں اس کے آگے سر جھکا دیتی ہیں ۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

بانگ درا میں اقبال نے مومن کی لامحدود قوتوں کی طرف یوں اشارہ کیا ہے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسی خیال کا بال جبریل میں یوں اعادہ کیا ہے ۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الہیٰ

سچا مومن مفلوک الحالی میں بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا اسے اپنی فقیری میں شاہی کے مزے ملتے ہیں لیکن جس شخص کا اعتقاد کچا اور ایمان کمزور ہوتا ہے اس کو مال و دولت کے باوجود حقیقی

آرزو، ایک بیش بہا نعمت ہے، اس کے بغیر زندگی بے لطف ہے خدا کے پاس ہر چیز موجود ہے اس کو آرزو کرنیکی ضرورت ہی پیش نہیں آتی اس لئے وہ اس کی لذت سے بھی غالباً واقف نہیں ہے۔ اقبال آرزو کے سوز و ساز کو بڑے سے بڑے معاوضے پر بھی دینے تیار نہیں ہے۔

متاع بے بہا ہے درد سوز آرزو مندی مقام بندگی دیکر نہ لوں شان خداوندی

انسان کو خدا کے ہنر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے قبضے میں سمندر، بجلی، وغیرہ سب کچھ ہے لیکن اس میں نقائص یہ ہیں کہ وہ خود شناس خدا شناس اور جہاں شناس نہیں ہے۔

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
وہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

سیاسیات

اقبال کو انسان کی موجودہ پستی کا شدید احساس ہے۔ اس کی یہ دلی تمنا ہے کہ انسان حقیقی معنوں میں اشرف المخلوقات بنے اس لئے وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کے مختلف خیالات پیش کرتا ہے۔ وہ کبھی علم و اخلاق کے خاص خاص نظریوں کی تلقین کرتا ہے تو کہیں تصوف کا درس دیتا دکھائی دیتا ہے ایک طرف زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی تدبیریں بتاتا ہے تو دوسری طرف انسان کو اس کی اصلی عظمت یاد دلاکر اس کی حمیت کو جوش میں لاتا ہے۔

اس کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو سیاسیات سے علحدہ کرنا بڑی اہم غلطی ہے۔ حکومت کی کوئی شکل بری نہیں بشرطیکہ حکمراں طبقہ اپنے دل میں حقیقی معنوں میں احساس مذہب رکھتا ہو۔ مذہب سے الگ رہ کر کوئی نظام حکومت عرصہ تک مفید نہیں رہ سکتا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مذہب معلم اخلاق ہے۔ جب سیاست اس کے تحت آجاتی ہے تو اہل سیاست اخلاق کی قائم کردہ حدود سے باہر نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ان پابندیوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اس صورت میں وہ اپنی پسند "کو قانون" اور اپنے مخصوص مسلک کو "مذہب" کی خلعت عطا کر کے اس کو رائج کرنیکی جان توڑ کوشش کرتے ہیں۔ ہر نیا حکمران اپنے نئے مسلک کی ترویج پر زور دیتا ہے۔ اس سے تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد انقلابات ہوتے رہتے ہیں جو امن عامہ کو خاک میں ملا دیتے ہیں آج دنیا میں کسی جگہ اشتراکیت کا ڈھول پٹ رہا ہے تو کہیں جمہوریت کا نقارہ بج رہا

ہے ۔ کہیں فاسطیت کے دف کی آواز آرہی ہے تو کسی جگہ نازیت کے دماغے پر مسلسل ضربیں پڑ رہی ہیں ۔ دنیا میں ایسا کون بدذوق ہے ۔ جو اس عظیم الشان کورس (Chorus) کو سنکر اپنی روح میں سکون محسوس کرتا ہے ؟قومیت کا بھوت ہر ملک میں ناچ رہا ہے اس کا اثر یہ ہے کہ ہر ملک اپنے مفاد کے لئے سب سے پہلے اپنے ہمسائے پر ہی ہاتھ صاف کرنے کی فکروں میں لگا ہوا ہے ۔ بھلا اس نفسی نفسی میں بھی کہیں امن پرورش پاسکتا ہے ؟موجودہ تہذیب کے فرزند مذہب کے ہاتھوں کو ہمیشہ "خون میں بھرا ہوا دیکھتے ہیں" اور اس سے ایک درندے کی طرح خائف ہیں ۔ لیکن ان اندھوں کو ذرا غور و فکر کی توفیق ہو تو معلوم ہو جائے کہ موجودہ تہذیب سراسر خون آلود ہے ۔ جنگ عظیم کے مقابلے میں مہابھارت کی جنگیں بچوں کی لڑائیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں پھر ان روشن خیال لوگوں نے ترک مذہب کر کے ایسا کونسا تیر مار لیا ؟ سچ تو یہ ہے موجودہ ترقی یافتہ ملکوں کی حکومت کی بنیاد مکاری پر قائم ہے جس کو "ترقی یافتہ لوگ سیاست" کے مہذب نام سے پکارتے ہیں ۔ یوں دیکھنے کو تو روس میں مزدور کی حکومت ہے ۔ اور جرمنی و ترکی میں جمہوریت قائم ہے مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ صرف اسٹالن ، ہٹلر اور کمال کے ارادوں اور عقیدوں کی روح دراصل تمام روس ، جرمنی ، اور ترکی میں جاری و ساری ہے ۔

زمام کارگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

حصول آزادی کے لئے اقبال قوت کو ضروری خیال کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ غلامی کے طوفان سے وہی لوگ صحیح سلامت پار اترتے ہیں جو اپنے سخت اور قوی بازوؤں سے موجوں کو مردانہ وار چیرتے چلے جاتے ہیں ۔ خالی ضد یا بھیک مانگنے سے آزادی حاصل نہیں ہوتی جو لوگ میدان جنگ کو اپنے خون جگر سے لالہ زار بنا دیتے ہیں وہی ایک دن عیش و عشرت کی مے لالہ فام کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں ۔

میں تجھکو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے شمشیر و سنان اول طاؤس در باب آخر

مناظر قدرت

بال جبریل میں اقبال نے مناظر قدرت کی عکاسی کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلے وہ اہل عالم کو جہان رنگ و بو کی سیر کا دلکش پیغام پہنچانا اپنا کام سمجھتا تھا ۔ لیکن اب وہ زمانے کو "داغہائے سینہء من کمتر از گلزار نیست" کا دلگداز نالہ سنانا اپنا فرض جانتا ہے اس کے باوجود بھی کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے مرقعے نظر آجاتے ہیں ۔ مثلاً ۔

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

یا

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار

راحت نصیب نہیں ہوتی۔

کافر ہے مسلماں تو امیری نہ فقیری مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

مصیبت میں صبر نہ کرنا اور پریشانیوں سے تنگ آکر نالہ و فریاد کرنا بزدلوں کا کام ہے۔ سخت سے سخت اذیت پہنچنے پر بھی مومن کی پیشانی پر شکن تک پڑنے نہیں پاتی۔

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند

اپنے متعلق

یوں تو اقبال کا سمند طبع ہر میدان میں یکساں جولانیاں دکھاتا ہے لیکن جہاں کہیں اس کو اپنے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملتا ہے وہاں خوب ہی جوہر دکھاتا ہے۔ اس کے نزدیک خدارسی کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ تلاش خودی ہے "جس نے خود کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا" اسی لئے وہ ایک جگہ کہتا ہے۔

غلام ہمت آن خود پرستم کہ از سوز خودی بیند خدارا

جب اقبال اپنے متعلق کچھ بیان کرتا ہے تو اس کا طرز کلام زیادہ قلندرانہ اور دلکش ہو جاتا ہے۔

فقیر راہ کو بخشے گئے اسرار سلطانی بہا میری نوائے دولت پرویز ہے ساقی

اقبال کو اپنے کمال کا احساس ہے اور اس عطا پر وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اپنی آزادی پسند طبیعت اور آزاد روی کی ایک جگہ یوں تصویر کھینچا ہے۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

مندرجہ ذیل شعروں میں اقبال کی سیرت کا عکس کس قدر واضح نظر آتا ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندہ حق بیں و حق آگاہ
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند
پرسوز و نظر بازو نکو بین وکم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر قند

ان مختلف اشعار کے علاوہ بعض مسلسل نظمیں مثلاً "لنین" "ذوق شوق" "ساقی نامہ" "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں و روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" "جبریل و ابلیس" "جاوید کے نام" اور "مسولینی لاجواب" ہیں ان میں اقبال کے عقائد کے نقوش زیادہ گہرے ہیں۔

بعض اشعار۔

اب یہاں ہم وہ اشعار درج کرنا چاہتے ہیں جو گزشتہ سرخیوں کے تحت نہیں آسکتے مثلاً طاقتور کی حکومت کامیاب ہوتی ہے کیونکہ اس کی نافرمانی کی جرات بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظریہ بالکل پہلے کی طرح اب بھی صحیح ہے۔

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

حکومت تو پھر حکومت ہے قوم کی اصلاح بھی بغیر قوت۔ نہیں ہو سکتی۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

نو گرفتار محبت بارگاہ حسن کے آداب سے پوری طرح واقف نہیں ہوتا۔ اس کو کیا خبر کہ روئے محبوب کو بیباکی سے دیکھنا کتنا بڑا جرم ہے وہ تشنگی۔ دیدار بجھانے کی خاطر بار بار چہرہ۔ دوست کی طرف نظریں دوڑاتا ہے۔ ابھی اس کا دل ایک حد تک اس کے قابو میں ضرور ہوتا ہے لیکن اپنی آنکھوں پر اس کا مطلق بس نہیں چلتا۔

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولی کہ دل سے بڑھکے ہے میری نگاہ بے قابو

موجودہ زمانہ کا مسلمان جس کے قوائے عملی تقریباً مفلوج ہو چکے ہیں اپنے اسلاف کے کارناموں پر ناز کرتا اور پدرم سلطان بود کے بے ہنگام راگ الاپتا پھرتا ہے اقبال اس سے یوں خطاب کرتا ہے۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تیری پرواز لولاکی نہیں ہے

یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تیری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

جب تک مسلمانوں میں ان کے اسلاف کے جوہر پیدا نہ ہوں گے وہ ذلیل و خوار ہی رہیں گے موجودہ مسلمان گفتار اور کردار کی صفت میں بھی اپنے آباو اجداد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے پھر ان کی زندگی کیونکر خوشگوار ہو سکتی ہے۔

اے لاالہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں گفتار دلبرانہ کردار قاہرانہ

بعض اوقات انسان کو دشمنوں سے زیادہ دوستوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ گھر کے بھیدی ہمیشہ سے لنکا ڈھاتے چلے آئے ہیں۔

خزاں میں بھی کب آسکتا تھا میں صیاد کے بس میں
میری غماز تھی شاخ نشیمن کی کم اوراقی

چھپانے کی کوشش میں راز اور بھی زیادہ آشکارا ہوتا ہے۔

کہہ گئی راز محبت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبط فغاں سمجھا تھا میں

عقل و عشق کا کس قدر پر لطف موازنہ ہے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

ایک سراپا نیاز بادہ خوار اپنے ساقی باوقار سے کس لجاجت کے ساتھ شراب مانگ رہا ہے۔

تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ تیرے پیمانہ میں ہے ماہ تمام اے ساقی

انسان اگر اپنی ناکامیوں اور مصیبتوں پر روتا ہی رہے تو اس کے اس کام کے لئے اپنی عمر بھی کافی نہ ہوگی اس لئے ہر افتاد پر رنج و غم کرنا مصیبت میں زیادہ شدت پیدا کرنا ہے۔

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

انسان کو حقیقی آزادی کبھی میسر نہیں آسکتی۔ جس طرح اس زندگی میں ایک مرتبہ مرنے پر انسان مجبور ہے اسی طرح دوسری زندگی میں وہ جینے پر مجبور ہے۔

ترے آزاد بندوں کو نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

بال جبریل بیشک بیسویں صدی کی بہترین تصنیفوں میں شمار ہونے کے قابل ہے اس کے ہر صفحہ پر زندگی کا ایک زبردست تلاطم نظر آتا ہے۔ اشعار کیا ہیں طوفان حیات کی فلک بوس موجیں ہیں جن میں مردہ قوموں کا جمود خس و خاشاک کی طرح چشم و زون میں بہہ سکتا ہے۔ جس شد و مد کے ساتھ اس کتاب میں

درس عمل پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر پیش کرنے سے کم از کم اردو ادب تو قاصر ہے ۔ یہ کتاب دراصل انقلابات و حوادث روزگار کے اسباب و علل کا آئینہ ہے ۔

* * *

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

فطرت کو خرد کے روبرو کر تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھوچکا ہے کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضاء ہے بیکرانہ تو بھی یہ مقام آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں چاک گل و لالہ کو رفو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہوسکا ، وہ تو کر

فلسفۂ عجم پر تبصرہ

(۱) فلسفۂ عجم۔ متوسط تقطیع ۱۸۹ صفحات۔ ملنے کا پتہ احمدیہ پریس چارمینار۔

یہ کتاب اردو کے مایہ ناز شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مشہور انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس کو جامعہ عثمانیہ کے ایک طلسانی مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے۔ ال ال بی نے آٹھ سال قبل مکمل کر لیا تھا۔ لیکن اردو زبان کی طباعی دقتوں کے باعث اب تک مسودہ کی حالت میں پڑا رہا۔ اور اب مولوی تصدق حسین تاج (مالک احمدیہ پریس) کی کوششوں سے شائع ہوا ہے۔

میر حسن الدین صاحب ان قابل فرزندان جامعہ عثمانیہ میں سے ہیں جنھوں نے اپنی سنجیدہ اور اعلیٰ ملی خدمات کی وجہ سے اپنی مادر جامعہ کی علمی شہرت قائم کر دی اور جو بغیر کسی سرپرستی یا قدر دانی کے محض علم کی خدمت اور ذاتی شغف کی بناء پر مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں ہماری فلسفہ اور فلسفہ برگساں عرصہ ہوا شائع ہو چکیں۔ اول الذکر میں فلسفہ کے مسائل اور نظریات اور فلسفہ جدید کے مختلف مکاتیب کو سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ موخر الذکر کتاب مشہور فرانسیسی فلسفی برگساں کے فلسفیانہ نظریات کی تشریح و توضیح کرتی ہے۔ اور اس میں خاص کر اس کے نظریہ ارتقائے تخلیق پر بحث کی گئی ہے۔ ان کی دو کتابیں مذہب و عقلیات عصر جدید میں اور مقالات فلسفہ اس وقت زیر طبع ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کی اصل کتاب فلسفہ عجم آج سے چھبیس (۲۶) ستائس سال قبل لکھی گئی تھی۔ علم و فضل کی فضاء میں عہد حاضر میں آئے دن جو جدید ترین تحقیقات اور تصنیفات شائع ہوتی رہتی ہیں ان کے لحاظ سے یہ کتاب تقویم پارینا سمجھی جا سکتی ہے لیکن اس عالم تغیر میں بھی بعض کتابیں تاریخی اہمیت حاصل کر لیتی ہیں اور یہی حال اقبال کی فلسفہ عجم کا ہے۔ اگرچہ خود ان کے خیالات میں بہت انقلاب پیدا ہو چکا اور اگر وہ اس کتاب پر نظر ثانی کرنے بیٹھیں تو ممکن ہے کافی تغیر و تبدل رونما ہو جائے تاہم اس کتاب کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو تعلیمی فلسفہ کے علاوہ ادبیات کے اہل ذوق کے لیے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

اس کتاب میں اقبال نے ایرانی قوم کی مخصوص روح اور اس کی خاص سیرت کو بے نقاب کرنے کے علاوہ تصوف کے متعلق نہایت حکمیاتی (سائنٹفک) بحث کی ہے یہ ایسے موضوع ہیں جن پر اردو زبان میں کوئی قابل ذکر تصنیف موجود نہیں ہے اس لحاظ سے میر حسن الدین صاحب کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور اس کا مطالعہ نہ صرف فلسفہ کے اہل ذوق بلکہ ادبیات اردو اور خاص کر شاعروں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کیونکہ سارا اردو ادب فارسی

تخیلات و معتقدات اور تصوف کی جھلکوں سے معمور ہے اور جو ارباب اردو اپنے ادب کو صحیح نقطہ نظر سے سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونگے۔ (تبصرہ نگار محی الدین قادری زور۔ مشمولہ مجلہ عثمانیہ ہنم شمارہ ۳، ۴۔ ۱۳۴۵ف ۱۹۳۶ء۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۔ اس سال جامعہ عثمانیہ کی جانب سے توسیعی لکچروں Extenrion leture کے لیے ڈاکٹر سر محمد اقبال کو مدعو کیا گیا تھا۔ صاحب مفر کے تین گرانقدر لکچر فلسفہ اسلام پر ٹاون ہال (باغ عام) میں ہوئے جن میں تعلیمی کلیہ نے بڑے شوق اور دلچسپی سے شرکت کی۔ پہلے روز جلسہ کی صدارت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بالقد بہم نے کی دوسرے روز نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر صدر رہے تیسرے روز نواب سر امین جنگ بہادر نے صدارتی فرائض انجام دیئے۔

ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر اقبال ان لکچروں کی بہت جلد کتاب کی شکل میں شائع کر کے اپنی اعلیٰ تحقیقات کے نتائج سے مشرق و مغرب کو مستفید فرمائینگے۔

سر اقبال سے مدیرین مجلہ اور انجمن اتحاد طلباء کے معتمد نے دار الاخیات میں ملاقات کی موصوف دیر تک جامعہ عثمانیہ کے متعلق گفتگو فرماتے رہے۔ مدیرین مجلہ کو اس امر کے معلوم ہونے سے بڑی مسرت ہوئی کہ وہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے مستقبل سے گہری ہمدردی اور دلچسپی رکھتے ہیں۔

ملاقات کے اختتام پر مدیرین نے مجلہ کی جلدیں تحفتہً ان کی خدمت میں پیش کیں جن کو سر موصوف نے مسرت کے ساتھ قبول کیا۔

(ڈاکٹر سر محمد اقبال کے لکچرس جنوری ۱۹۲۹ء کی رپورٹ مشمولہ مجلہ عثمانیہ جلد دوم شمارہ ۲، ۳۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

اقبال کا اثر اردو شاعری پر

اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہیں ۔ ان کے کلام سے اردو شاعری کا متاثر ہونا لازمی ہے لیکن ہم سے زیادہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس اثر کو ٹھیک ٹھیک طور پر متعین کر سکیں گی ۔ کسی شاعر یا ادیب کی زندگی میں اسکی خدمات کا کامل اندازہ مشکل سے کیا جاسکتا ہے خاص کر اقبال جیسے شاعر کی خدمات کا جس کی ذہنی دنیا میں اب تک کئی انقلاب آئے اور جس کا ہر نیا کارنامہ ایک نئے رنگ میں رنگا ہوا منظر عام پر آتا رہا

اقبال کی شاعری ان کے قلب و دماغ کی کشمکش کی آئینہ دار ہے ۔ انہوں نے اپنے جدید مجموعہ کلام میں اپنی نسبت بالکل ٹھیک لکھا ہے ۔

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

مگر یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے شاعر اعظم کا سوز و ساز پیچ و تاب بیکار نہیں ثابت ہوا ۔ اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک نئی بہار اپنے ساتھ لا رہا ہے ۔ ان کی فطرت پرستی ان کی وطن دوستی ، ان کا فلسفہ ، مولانا روم سے ان کی والہانہ عقیدت ، ان کا ذوق آگہی ان کی تہذیب مغرب سے بیزاری ، ان کی جرات رندانہ ، ان کی فقیری و قلندری ، غرض ان کے ذہنی ارتقاء کا ہر پہلو ایک نئی شان سے ان کے کلام میں جلوہ گر ہے وہ چاہیں جو موضوع اختیار کریں ان کا کمال شاعری ہر جگہ نمایاں ہے ان کے قلب و دماغ کی غیر معمولی وسعتیں اور بے پناہ گہرائیاں ان کے ہر طرز کے کلام پر اثر انداز ہیں ۔ وہ جس رنگ کا چاہیں جامہ پہن لیں ان کا انداز قد چھپ نہیں سکتا ۔

اقبال کی شاعری کے مختلف دور ان کے کلام کی اہم خصوصیتیں اور اردو شاعروں میں ان کا درجہ ، یہ سب ایسے موضوع ہیں جن پر اطمینان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کہا جاسکتا ہے ۔ لیکن ان کے کارنامے اردو شاعری کو کس طرح متاثر کر رہے ہیں اور اردو کے جو شاعر ان سے متاثر ہو رہے ہیں وہ ہندوستان کی جدید سیاسی فضا میں اس اثر کو کس حد تک باقی رکھیں گے ، اور مستقبل کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس رنگ میں کس طرح کی تبدیلیاں کریں گے اس کا صحیح اور کامل اندازہ مستقبل ہی میں ہو سکے گا ۔ اس وقت تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ خود اقبال اپنے اس مسلسل سوز و ساز اور پیہم پیچ و تاب کی وجہ سے کس منزل پر جاکر ٹھہریں گے ؟ اور ان کی شاعری ابھی کس کس طرح کی فن کاریوں سے مزین اور کیسے کیسے کمالات سے بہرہ ور ہونے والی ہے ؟ تاہم " زرہ امتثال امر " اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہے اس لئے اردو شاعری کی تاریخ

پر آئندہ کے متعلق جو نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں انہی کے بل بوتے پر اظہار خیال کرنے کی جرات کی جاتی ہے

اردو زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اچھی طرف واقف ہیں کہ ہماری شاعری اب تک جو مدارج طے کرتی آئی ہے اور جس طرح مختلف زمانوں میں مختلف رجحانات کی حامل رہی ہے وہ زیادہ تر اقبال جیسے عظیم الشاں شاعروں ہی کی عہد آفرینیوں کا نتیجہ ہیں۔ ابتدا میں اردو شاعری مذہبی خیالات کی تبلیغ اور عقاید کی اشاعت کے لئے استعمال کی گئی۔ چنانچہ بزرگان دین نے عوام کی خاطر اردو میں شعر لکھے جو عام مجالس سماع میں گائے جانے کے علاوہ شرفا کی محفلوں میں بھی مثنوی مولانا روم کی طرح پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔

یہ اردو کا ابتدائی دور تھا۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت استوار ہو گئی اور استحکام سلطنت کے ساتھ ہی رزم آرائیاں بزم ارائیوں میں منتقل ہونے لگیں ایسے وقت میں گولکنڈہ کے ایک اہل ذوق تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اردو شاعری کے ابتدائی مذہبی رجحان کو ادبی رنگ سے بدل دیا۔ وہ پہلا عظیم الشان اردو شاعر ہے جس نے ہماری شاعری کو جملہ فن کارانہ خوصیتوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کا نام نہ صرف شہر حیدر آباد کا بانی ہونے کی حیثیت سے تاریخ میں زندہ رہے گا بلکہ اردو شاعری کو فارسی کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرنے کے سبب اور جملہ اصناف سخن میں پہلا اردو دیوان مرتب کرنے کی وجہ سے ہر اردو دان سے خراج عقیدت حاصل کرتا رہے گا۔

یہ پہلا استاد سخن تھا جس کے اثر سے ہماری شاعری مذہبی رنگ اور محدود و اصناف سخن کی قیود سے آزاد ہو گئی۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد دوسرا عظیم الشان اردو شاعر جس نے ہماری شاعری کو متاثر کیا ولی اورنگ آبادی ہے جس کو بابائے ریختہ کہا جاتا ہے۔

ولی ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا جب سلطان محمد قلی کی سلطنت کے ساتھ ساتھ اس کا پیدا کیا ہوا دور شاعری بھی ختم ہو رہا تھا۔ ایسے نازک وقت میں اردو کو سنبھالنا اور اردو شاعری کا بول بالا کرنا ولی ہی کی کرامت تھی۔ چنانچہ ولی نے فاتحین کے روزمرے اور دہلی کے لشکر یا اردو معلی کی زبان سے مفتوحین کی زبان یعنی دکنی اردو کا امتزاج کیا اور اس طرح اردو دکن کے علاوہ شمال میں بھی شعر و شاعری کے لئے رواج پا گئی ورنہ اس سے قبل وہاں کی علمی و ادبی زبان فارسی تھی اور اگر اس وقت تک وہاں اردو میں کچھ لکھا بھی گیا تھا تو اس کی حیثیت ویسی ہی تھی جیسی دکن میں محمد قلی کی عہد آفرینی سے قبل کے اردو کارناموں کی تھی۔ ولی کا اثر اتنا ہمہ گیر تھا کہ دہلی کے تمام فارسی گو شاعروں نے ولی کی تقلید میں اردو میں شعر کہنا شروع کر دیا اور یہ زبان جو اس وقت تک بازاروں میں بولی جاتی تھی اور عوام کے اظہار خیال کا ذریعہ تھی خواص کی محفلوں اور ادبی مجلسوں میں باریاب ہو گئی۔

ولی کے بعد مرزا مظہر جان جاناں کی ایسی ہستی تھی جس نے پھر اردو شاعری کو متاثر کیا اور اس کا رخ بدل دیا۔ مرزا مظہر نے یہ تحریک شروع کی کہ ولی کی زبان میں شعر کہنے کے بجائے دہلی کے شعراء کو خالص اردوے معلیٰ کی زبان میں شاعری کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ایک دوسرے ملک کی زبان اور محاورہ کی تقلید میں کامیابی حاصل کرنا غیر فطری امر ہے"۔ حضرت جان جاناں کی یہ تحریک آسانی سے کامیاب نہ ہو جاتی اگر میر و سودا جیسے رفیع المرتبت شعرا ان کے خیال پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ ان دو اساتذہ سخن کا اردو شاعری پر اتنا اثر پڑا کہ اردو زبان سے دکنی عنصر کم ہونے لگا اور چونکہ دکنی الفاظ کو کم کر کے مغلیہ لشکر یا اردو معلیٰ کے الفاظ اور محاورے رائج کئے گئے تھے اس لئے اس زبان کا نام ہندستانی باقی نہ رہا بلکہ زبان اردو قرار پایا

اس دور سے پہلے ہماری زبان کا نام اردو نہیں تھا۔ بلکہ ہر جگہ کے لوگ اس کے اپنے مقام کی ہندستانی یا ہندی کہتے تھے۔ مثلاً دکن کے عہد قطب شاہیہ کے شعرا یا مصنفین نے اپنی زبانوں کو یا تو ہندوستانی کہا یا دکنی۔ غرض میر و سودا کی وجہ سے مغلیہ لشکر یا اردو کے الفاظ کا ہماری زبان پر قبضہ ہو گیا

میر و سودا کے بعد لکھنو میں ناسخ و آتش نے اس زبان اور شاعری کو متاثر کیا جس کی وجہ سے اردو میں ہمہ گیری پیدا ہو گئی اور ایک ایسی باضابطہ اور منضبط زبان بن گئی کہ اب تک ہمارے شاعر لکھنو ہی کی معین کی ہوئی زباں میں شاعری کرتے ہیں۔

ناسخ و آتش کے بعد آزاد و حالی نے پھر اردو شاعری پر اثر ڈالا۔ اس دفعہ زبان سے زیادہ خیالات متاثر ہوئے کیونکہ لکھنوی شعرا نے زبان پر اتنا زور دیا تھا کہ اس کا رد عمل ہونا ضروری تھا مطالب و معانی کی خوبیوں کا اتنا خون ہوا تھا کہ اس کا رنگ لانا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ اس دور کی اردو شاعری اپنے عہد کی زوال پذیر معاشرت کی ترجمان تھی اس لئے اس میں وہ تمام عناصر راہ پا گئے جو قوموں کو ترقی سے زیادہ تنزل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حالی اور آزاد نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اپنی حد تک اپنے مقصد میں کامگار رہے۔ لیکن جس طرح مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک میر و سودا کی وجہ سے کامیاب ہوئی اور اردو شاعری کی شکل بدل گئی بالکل اسی طرح اور آزاد کی اصلاحی کوششیں آج کلام اقبال کی وجہ سے تکمیل کو پہنچ رہی ہیں۔

اقبال نے تخیل کی جولانیوں کے لئے ایسے ایسے میدان کھول دیئے ہیں جن کی طرف سے اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرا دیا۔ اردو شاعروں کا فرضی معشوق اپنی کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور جھوٹی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال نے لفظی چٹکلوں

اور دور از کار محاورہ بندیوں کی جگہ حقایق کی تلمیح اور سیاسات حاضرہ کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کر دیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع ہی بدل گئے اور شاعری واقعی ساحری بن گئی اقبال نے صاف صاف اعلان کر دیا۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بیگانے تو ناخوش رہتے ہیں لیکن اقبال سے اپنوں کا خفا ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ انہوں نے غالب کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلودہ نہیں کیا

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو نہ کر خارا شگافوں سے تقابلہ شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ لکھا ہے۔

عزیز تر ہے متاع امیر و سلطان سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے لوازم غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے نامانوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ زبان و محاورہ کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے۔

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زبان سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہیں
مری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز دروں مے خانہ
تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی، حقیقت نگاری، شاعری کے لوازم ہوتے جارہے ہیں۔ معاملہ بندی آسمانوں یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیب روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، دلی یا لکھنو کے محاوروں یا روزمروں کی پابندی غرض طرح طرح کے قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جارہی ہے۔ مولوی حالی نے پھر بھی قدیم مشرقی مروت سے کام لیا تھا اور شعرائے نازک خیال کے تکلفات لایعنی اور خیالی لوازم شعری کی مدافعت اس مہذب پیرانہ میں کی تھی کہ

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبال ضروریات زمانہ کے پیش نظر سخن آرائی کے قایل ہی نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کر کے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پرواہ کر دیا اردو شاعری یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لئے وقف ہو گئی یا چند موضوعوں کے لئے محدود کر دی گئی۔ اقبال اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل ہیں۔ وہ اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کا پیرایہ بیان بھی خود بخود اچھا ہی مل جائے گا۔ اور بغیر مشاطگی یا پروپگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

دوسرے شعرا کی طرح اقبال اپنے کلام کو جام مے بنا کر گردش میں لانا نہیں چاہتے بلکہ وہ اہل محفل کو دعوت عمل دیتے ہیں کہ اس ثمر سے وہ خود مے لالہ فام نکال لیں۔ اور جو اس دعوت پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوق خودی نہیں رکھتے ان سے تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے۔

نظر نہیں تو مرے حلقہ سخن میں نہ بیٹھ کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کی محفل ان کے کلام کو سمجھنے اور اس سے کما حقہ محظوظ ہونے کے قابل نہیں ہوئی۔ ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں۔

کاروں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہل مدرسہ و اہل خانقاہ بھی اس ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں اور اسی محرومی کی وجہ سے

اب تک ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اقبال کا شعر ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے فقیہ و صوفی و ملا کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔

جلوتیاں مدرسہ کورنگاہ و مردہ ذوق
خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام جستجو کھوئے ہوؤں کی آرزو

ان کے خیال میں اضطراب و اثر اور خون جگر کے بغیر سخن بے فیض ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص یعنی اظہار بوالہوسی اور زلف و کاکل اور خد و خال، کے مضامین باندھنے کی کیا اچھی توضیح کی ہے کہ۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ تاریک مین قوموں کے مزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گرو افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ کہ "آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار" جتنا اردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا۔

عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی حفاظت کریں۔ جب تک ادیبوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا نہ ہوگا کوئی شاعری ملک و قوم کے لئے وجہ، حیات اور باعث وقار ثابت نہیں ہو سکتی۔

سرودو شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے وہ بیکار ہے۔ وہ باد سحری کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی کو شگفتگی میں نہ بدل سکیں۔ اقبال کہتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے۔

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہرچہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز

آخر میں، ہم اقبال کی اس نظم کے چند شعر بھی سنائے دیتے ہیں جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لئے لائحہ عمل کا کام دے رہے ہیں اور جن میں اقبال شاعری سے مخاطب ہیں۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس تُو
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لئے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مئے

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعت نظر اور مرحلہ شوق کی گوناگونی جو اردو شاعری کو متاثر کر رہی ہے۔ اقبال کی تلخ نوائیوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ سلیم و سیماب، اور جوش و ساغر جیسے پختہ مشق شاعروں کو بھی متاثر کر دیا۔ اقبال کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ میں ناسخ و آتش کے اثر سے الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان متروک ہو گئے تھے اور آج اقبال کے اثر سے بہت سے فرسودہ خیالات لایعنی تکلفات اور غیر ضروری لوازم شعر متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اردو شاعری اقبال کے کلام سے متاثر رہے گی اور اہل اردو میں زندگی اور زندہ دلی قائم رکھنے کا باعث ہو گی۔

عزیز احمد

اقبال کی شاعری
میں
حسن و عشق کا عنصر

جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزاء میں مجھے
حسن بے پایاں ہے درد لا دوا رکھتا ہوں میں
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ! وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں
فیض ساقی شبنم آسا ظرف دل دریا طلب
تشنہ دائم ہوں آتش زیرپا رکھتا ہوں میں
محفل ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں

(اقبال)

(۱)

نفسیاتی رجحانات

حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہر انسان میں کم و بیش موجود ہے اور اسی طرح حسن میں محو ہو جانے اور حسن کی طرف کھنچ جانے یا حسن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت بھی انسانی فطرت کا ایک عنصر ہے۔

شاعر میں یہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جذبات اس قدر عمیق اور اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ جب ان میں جوش آتا ہے تو وہ اس کی ذات میں سما نہیں سکتے اور الفاظ اور نغمے بن کر ابل پڑتے ہیں

حسن شاعر کے جذبوں پر چھا جاتا ہے اور جذبوں میں ایک تپش، ایک جوش، ایک بیتابی پیدا ہو جاتی ہے یہ بیتابی عشق ہے اور جب یہ بیتابی اس کے قلب کی لطافتوں اور اس کے دماغ اور ادراک کی مدد سے الفاظ و معانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو شعر بن جاتی ہے۔ اسی لئے اگر عشقیہ شاعری کی صحیح تعریف کی کوشش کی جائے تو صرف انہی الفاظ میں اس کی تعریف جاسکے گی کہ وہ ایک انسان کے لطیف احساسات اور بے چین جذبات کا عکس ہے اگر یہ عکس بے ساختہ پڑے تو شاعری حقیقی اور سچی ہے۔ اور اگر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے۔ یا کوئی اور مصنوعی دلکشی پیدا کی جائے تو عکس لاکھ خوبصورت ہو اس میں وہ فطری حقیقت باقی نہیں رہیگی جس طرح عشق ایک اضطراری جذبہ ہے اسی طرح عشقیہ شاعری میں بھی اضطرار کی جھلک ہونا ضروری ہے اور یہی اضطرار شعر میں وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ شعر متحرک ہو جاتا ہے۔

عشقیہ شاعری دل کی شاعری ہے اور اقبال دل سے زیادہ دماغ کے شاعر ہیں۔ عشق ان کے نزدیک ایک اضطراری چھا جانے والا محو کر دینے والا جذبہ نہیں، جس کا جادو انہیں اور ان کی پوری ہستی کو مسحور کر دے عشق ان کے نزدیک ایک حقیقت ہے اور وہ اس حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں ان کے پورے کلام میں ایک نظم بھی ایسی نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جذبات کے افسوں سے اس قدر مسحور ہیں کہ فطرت ان سے خود بخود لکھوا رہی ہے۔ عشق ان کی شاعری کا "باعث" نہیں "مقصد" ہے۔

"عشق" کا جو تصور اقبال کے ذہن میں ہے وہ ایک مستقل اور عظیم الشان حقیقت کا تصور ہے۔ اور اس حقیقت کی جستجو اس کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کی کوشش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کی ہستی اس حقیقت سے بالکل الگ ہے۔ کلیم دور سے طور کے شعلوں کو دیکھ رہا ہے اور ان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس تصور نے اقبال کے عشقیہ کلام میں دو خصوصیتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو یہ کہ عشق ہمیشہ ایک فلسفیانہ مبحث بنتا گیا۔ دوسرے یہ کہ فطری لطافت "سادگی اور پرکاری" اور نازک اور لطیف شعریت جو دل پر اثر کرنے والی شاعری کی جان ہے۔ ان کے عشقیہ کلام میں تقریباً مفقود ہے۔

اقبال شاعری کے لئے ہمیشہ ایک "مقصد" کو اپنا منتہائے نظر بنائے رہے۔ خود "شعر" کی اہمیت ان کے مقصد میں زیادہ نہیں تھی۔ ان کا پیغام الفاظ کی طرح جذبات سے بھی "ماورا" رہا اور ہر وہ شاعر جو پیغام لے کر آتا ہے محض جذبات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک قوم، ایک جماعت کے جذبات کا رہبر ہوتا ہے محض اس پیغام کے اثر سے اقبال کی عشقیہ شاعری میں ذاتی اور شخصی رنگ ہمیشہ پھیکا رہا۔ جہاں انہوں نے عشق کے جذبے سے اپنی ذاتی تاثر کا اظہار کیا ہے ان کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہو گئی ہے لیکن جہاں انہوں نے عشق کا بلند اور پاکیزہ تر تصور ایک قوم کے لئے لائحہ عمل بنا کر پیش کیا ہے وہاں اس میں رفعت

اور بلندی پیدا ہو گئی ہے۔

اسی شان رہبری نے عشق کو ان کے نزدیک ایک تصور بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسا تصور جو ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی کو گرما سکے۔

عشق اقبال پر چھا نہیں جاتا۔ وہ حسن کو دیکھنے اور عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کا زوایہ نظر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اسے ایک پوری قوم کا زوایہ نظر بنا سکیں۔

(۲)

اقبال کے کلام میں حسن و عشق کے عنصر کی نشوونما

اقبال کے مشق سخن کے زمانہ میں داغ و امیر کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا۔ "زبان" کی خوبیوں کی طرف شعر فہموں اور شاعروں کی توجہ تھی۔ اور گو یہ شاعری برائے نام عشقیہ شاعری تھی۔ مگر اسی کی وجہ سے عشقیہ شاعری کا صحیح مفہوم مٹ چکا تھا۔

"غزل" جب اردو میں آئی تو تصنع بھی اس کے ساتھ آیا۔ اور جہاں تصنع کا زور ہوا۔ جذبات کی صحت ختم ہو جاتی ہے لفظی خوبیاں، جب شاعری کا اصول بن جاتی ہیں تو جذبات کے فطری اظہار کی شاعری میں صلاحیت نہیں رہتی۔ اردو شاعری سے شعر کی روح پرواز کر چکی تھی۔ مردہ جسم کی آرائش کی جارہی تھی اور مصری ممی کی طرح، طرح کے مسالے لگا کر اس جسم کو باقی رکھنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔

اس ماحول میں اقبال نے شاعری شروع کی۔ لیکن اسی ماحول کے ساتھ ساتھ ایک نیا ماحول بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ سر سید اور حالی کا پیدا کیا ہوا ماحول تھا۔ مغربی شاعری کے اثرات بھی پڑنے لگے تھے۔

اقبال کی ابتدائی غزل گوئی میں داغ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ داغ سے انہوں نے اصلاح بھی لی تھی اور داغ کے وہ بہت معترف تھے داغ کے مرنے پر انہوں نے ایک نوحہ بھی لکھا۔ امیر کی شاعری کا بھی ان پر کافی اثر تھا۔ خود لکھتے ہیں۔

عجیب شئے ہے صنم خانہ امیر اقبال　　میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

اقبال کا تغزل بے روح اور بے رنگ تھا۔ ابتدا سے لے کر آخر تک کبھی ان کی غزلیں حقیقت کا خفیف سا اثر بھی پیدا نہ کر سکیں کہیں ان میں لطف اور سوز و گداز نہیں۔

بعد کی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات نے اور علو تخلیل نے جابجا جذبات کے فقدان کی تلافی کی ہے مگر عشقیہ رنگ کہیں نہ نبھ سکا۔ لیکن وہ دوسرا ماحول جو اقبال کی شاعری پر اپنا اثر ڈال رہا تھا۔ یعنی حالی اور سر سید کا ماحول بہت کامیابی سے اقبال کو اپنے آپ میں جذب کر سکا۔ وہ مغربی شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے رہے اور ان کا اثر بھی ان پر پڑتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس بے روح تغزل اور اس حقیقت سے عاری شاعری کا ایک شدید رد عمل اقبال کی قومی، اخلاقی، اور ان نظموں میں ظاہر ہونے لگا جو انہوں نے مناظر قدرت یا

قدرت کے اہم اجرام کو دیکھ کر یا ان سے مخاطب ہو کر لکھیں۔

اس زمانہ میں اقبال کے ذہنی ارتقاء کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک بہت اہم چیز معلوم ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے جذبے کو ان کی فطرت سے جذباتی مناسبت سے زیادہ ذہنی مناسبت تھی۔ سب سے زیادہ جن مغربی شاعروں کا ان پر اثر ہوا وہ گوئٹے، ورڈسورتھ، شیکسپیر اور گرے تھے۔ ان میں سے کوئی خالص جذباتی شاعر نہ تھا۔ ہر ایک دل سے زیادہ دماغ کا شاعر تھا۔ اس اثر سے اقبال کی اس نفسیاتی کیفیت کا پتہ چلتا ہے کہ ان پر عشق جذبہ بن کر نہیں چھا سکتا تھا۔

فلسفے کے مطالعہ نے جہاں اقبال کے تمام تر زاویہ ہائے نگاہ کو ایک مستقل اور مکمل حیثیت دیدی۔ وہاں حسن و عشق کے متعلق بھی ایک خاص نقطہ نظر کی تعمیر کی۔ فطرت ہی نے انہیں جذبات پرست طبعیت عطا نہیں کی تھی۔ فلسفے کے مطالعہ سے جو ذہنی ارتقاء ہوا اس نے عشق اور حسن کے مطالعے کو ان کی شاعری میں بجائے جذبے کے ایک "فکر" بنا دیا اور جس طرح نیم فلسفیانہ اور نیم شاعرانہ فکر سے دور زندگی کی اہم خصوصیتوں کو دیکھنے اور پرکھنے لگے انہوں نے عشق کو بھی دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کی شاعری کا اہم ترین مقصد قومی شاعری تھی عشق کے متعلق ان کا تصور تشکیل پا رہا تھا لیکن ابھی یہ تصور "پیغام" نہیں بنا تھا وطنیت اور قومیت ان کے اہم ترین پیغام تھے۔

یورپ جانے کے بعد ان کے نقطہ نظر میں بہت اہم تبدیلی ہونے لگی۔ وطنیت جو ان کی شاعری کے پہلے دور کا پیغام تھا ان کو باطل نظر آنے لگا۔ اسلامیات کے مطالعے اور گوناگوں مختلف اور متضاد اثرات سے ایک نئے اہم پیغام نے ان کی ہستی کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ پان اسلامی تحریک ان کو اس قدر متاثر کر گئی کہ وہ وطنیت کے جوش کو بھول گئے اور یہ پان اسلامی تحریک جو مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر مشتمل تھی۔ ان کی ہستی میں ایک اہم انقلاب پیدا کرنے لگی۔

یہ ان کے قیام یورپ کا زمانہ تھا۔ وطنیت کے تخیل کو وہ باطل قرار دے چکے تھے اور پان اسلامزم کا اثر مستقل اور مکمل طور پر چھانے نہیں پایا تھا اور اس زمانے میں جب کہ ان کی ذات ان کی ہستی میں نئی تعمیر ہو رہی تھی ایک نئے تخیل اور نئے تفکر کی دنیا بن رہی تھی۔ ان کی شاعری نسبتاً کم اہم اور ذاتی اور شخصی احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن سکی۔ ان کی شاعری کا اصل مقصد یعنی انکا "پیغام" ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے ان کی شاعری اس زمانے میں بڑی حد تک شخصی اور ذاتی شاعری بنی رہی۔ جابجا انہوں نے جذبات نگاری کی کوشش کی۔ چند عشقیہ نظمیں لکھیں۔ عشق کے متعلق اشعار کہے۔ ان میں سے کسی نظم میں درد و اثر، حسن و لطافت کی گرمی پیدا نہ ہو سکی۔

عشق کا مغربی اثر ان کی شاعری پر پڑا۔ یہ اثر جو شخصی اور مجازی تھا۔ کبھی تو مجازی جذبے کے شخصی اظہار کی صورت میں (مثلاً۔۔۔۔ کی گود میں بلی کو دیکھ کر) کبھی مغربی نظموں سے متاثر خیالات کی

شکل میں (مثلاً" حسن اور زوال) نمودار ہوا یہ اثر محض ایک شاعر کی وقتی مشقوں" سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن عشق کے متعلق جو نظمیں انہوں نے اس زمانہ میں لکھیں یعنی جن میں ذاتی تاثر زیادہ نمایاں نہیں۔ اور جن کی تحریر "مقصد" رکھتی ہے ان میں سے اکثر نظمیں باعتبار تخیل بہت بلند ہیں۔

پان اسلامزم کے اثرات جو اقبال کے ذہن پر چھا رہے تھے اور ان کی شاعری کا مذہب بن رہے تھے اسی زمانے میں دو مختلف طریقوں سے ان کے کلام کے عشقیہ عنصر پر اثر انداز ہوئے ایک تو یہ کہ ان کے کلام میں مولانا روم کے اثر اور تصوف کے رنگ کی ابتدائی چاشنیاں جابجا پیدا ہونے لگیں۔ دوسرے یہ کہ عشق مجازی میں بھی مشرقی اور اسلامی حسن کا تخیل اور تصور ایک روحانی معیار بننے لگا۔ یہ تصور سب سے پہلے ایک مکمل اور دلکش اثر کی شکل میں "سلیمیٰ" کی تحریر کا باعث ہوا۔

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے
خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے خلوت کدے میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا

سلیمیٰ عرب کی پرانی محبوبہ ہے اور شاعر حقیقت کے کیف کو مجاز میں متخیل کر کے مشرقی شاعری کی روایت کو جس میں مجاز و حقیقت، ہمیشہ ایک دوسرے میں عیاں اور نہاں ہوتے ہیں۔ ایک نئے اور جدید رنگ سے زندہ کرتا ہے۔

عشق حقیقی کے عناصر کی نشوونما پر، ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

اس زمانہ کی عشقیہ شاعری کی چند اور خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ ہر عشقیہ نظم میں اس کا احساس ہوتا ہے کہ جذبہ دل سے نہیں نکلا تخیل، ہمیشہ نظم کی تشکیل کا باعث نظر آتا ہے۔ جذبہ میں جوش نہیں، اثر نہیں، حقیقت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی دماغ رنگین کھلونے بنا رہا ہے اور ان سے تفریحاً کھیل رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اکثر نظموں کی تہ میں کوئی واقعہ یا مشاہدہ یا حقیقی قلبی کیفیت کام کر رہی ہو۔ لیکن کسی طرح یہ واقعہ یا مشاہدہ یا قلبی کیفیت ایسی نہیں ہوتی جو اقبال کو بالکل مست کر گئی ہو۔ یا گرما گئی ہو۔ اگر ان پر کوئی اثر پڑا ہے تو وہ اس سے ضرورت سے زیادہ شعری کام لینا چاہتے ہیں۔ جذبے کے فقدان کے باعث، باوجود تخلیل کی رفعت کے زبان اور تناسب کا جامہ جابجا چاک ہو جاتا ہے۔

زبان کی فطری سادگی، فطری جوش اور فطری اصلیت کی سب سے زیادہ ضرورت عشقیہ شاعری میں ہوتی ہے۔ اور اقبال کو زبان پر بالکل اختیار نہیں۔ ایک مصرع میں اگر جوش اور اثر ہے تو دوسرا بالکل پھس پھسا ہے۔ ضرورت شعری کے لئے ٹکڑے کے ٹکڑے زبردستی بھرے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب بالکل غلط ہے اور وہ تناسب جو شاعری کے جسم کے لئے کسی حسینہ یا کسی حسین مجسمہ کے جسم سے زیادہ ضروری ہے وہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔

اقبال نے "بانگ درا" کی اشاعت کے سلسلہ میں اکثر نظموں پر نظر ثانی کی۔ اور یو۔پی کے نقادوں کے بے پناہ اعتراضات سے کم سے کم اس حد تک متاثر ہوئے کہ زبان کی چند اہم لغزشیں دور کر دیں۔ پھر بھی عشقیہ نظموں کی حد تک یہ تبدیلیاں کافی نہیں ہوئیں۔ جوش اور اصلیت کے لئے زبان کی اس قدر صفائی کافی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ان کی مشہور اور ایک حد تک دلفریب نظم "حسن و عشق" کا پہلا بند یہ ہے۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمین قمر
نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوہ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم
موجہ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یوں ہی دل میرا

پہلے مصرعے میں وہ سلاست اور روانی اور بے ساختگی نہیں جو ایک لطیف جذباتی نظم میں ہونا چاہئیے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ "آنچل" اس وجہ سے بہت بے محل ہو گیا ہے کہ پوری نظم کے لہجہ میں رفعت اور شوکت پائی جاتی ہے اور یہ لفظ جو کسی زیادہ مادی نظم میں بہا رد ے جاتا، اس نظم میں باوجود اس کے کہ خالی "آنچل" نہیں "نور کا آنچل" ہے نظم کی فضا میں اجنبی سا معلوم ہوتا ہے اور اس ٹکڑے کی وجہ سے تخلیل کے رنگ میں ایک ناہموار شوخی سی پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن بعض جگہ یہی نظم ان بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔

تو جو محفل ہے تو ہنگامہ محفل ہوں میں
حسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے
تیری تصویر سے پیدا میری حیرانی ہے

حسن کامل ہے ترا، عشق ہے کامل میرا

(۳)

مطالعہ فطرت اور حسن و عشق کے عناصر

فطرت کا مطالعہ اقبال کی شاعری کے اولین اور بنیادی عناصر میں سے ہے۔ ان کا مطالعہ فطرت بھی جذباتی نہیں، ذہنی ہے۔ فطرت سے ان کی قوت ادراک مستفید ہوتی ہے۔

اقبال کی شاعری کے حسن پرست اور عشقیہ عناصر پر ان کے مطالعہ فطرت کا اثر ہونا ضروری تھا سب سے زیادہ جس حسن نے اقبال کے قلب و ادراک پر اثر ڈالا ہے۔ وہ فطرت کا حسن ہے۔ فطرت کے مختلف عناصر سے مخاطب ہو کر یا ان کے متعلق اقبال نے نظمیں لکھی ہیں۔

مطالعہ، فطرت کی حد تک ورڈ سورتھ کا اثر اقبال پر بہت گہرا پڑا۔ فطرت میں وہ دو چیزیں دیکھتے ہیں۔ ایک تو فطرت کے ایک مظہر کا تعلق اور ربط دوسرے مظہر سے یہ فطرت کی ایک عاشقانہ کیفیت ہے دوسرے انسان اور فطرت کا موازنہ یہاں وہ ورڈسورتھ کو چھوڑ کر مولانا روم اور متصوفین کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان فطرت کا مظہر کامل ہے۔

چنانچہ ان کی دو نظمیں جن میں حسن و عشق کے احساسات مطالعہ، فطرت کا نتیجہ ہیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ کہ جن میں وہ فطری عناصر کی باہم محبت، یا کسی مظہر فطرت کے حسن یا کسی کے عشق سے نتائج کا استخراج کرتے ہیں اور ان سے حسن اور عشق کے معیار انسانوں کے لئے تعمیر کرتے ہیں ان نظموں میں فطرت، انسان کے معیار حسن و عشق اور ترغیب عشق کے لئے نمونے اور مثال کا کام دیتی ہے۔ مثلاً "جگنو" کی چمک سے وہ حسن کے اس تصور تک پہنچتے ہیں۔

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسمان کا شاعر، کا دل ہے گویا
واں چاندانی ہے جو کچھ۔ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں، ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشی، ازل ہو

یا مثلاً "غنچہ۔ ناشگفتہ" اور "آفتاب" میں سحر کے "عارض رنگیں" کی جلوہ فرمائی پر کلی کا "سینہ زرین" کھول دینا۔ انسانی عشق کی اس دعوت کا بہانہ بن سکتا ہے کہ

مرے خورشید ، کبھی تو بھی اٹھا اپنا نقاب
بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینہ میں
عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں

اور اس کے بعد انشراح کی یہ کیفیت منقلب ہو جاتی ہے۔

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کروں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کردوں

دوسری قسم کی وہ نظمیں جن میں مطالعہ فطرت حسن و عشق کے عناصر کی تحریک کا باعث ہوا ہے، وہ ہیں جن میں اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ فطرت کا حسن بے سوز ہے۔ فطرت میں محبت کا شرر نہیں۔ فطرت میں اور انسان میں بھی یہ چیز مابہ الامتیاز ہے۔ انسان کو عشق نے "حرارت سوز دروں" عطا کی ہے۔ انسان میں جلنے اور جلانے کی صلاحیت موجود ہے اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو تمام مظاہر فطرت سے بالاتر قرار دیتی ہے۔ مظاہر فطرت کی زندگی فانی ہے۔ انسان عشق کی وجہ سے باقی ہے۔ انسان کو محبت کے باعث زندگی، دوام حاصل ہے۔ "ستارہ صبح" جب اپنی بے ثباتی کی شکایت کرتا ہے تو اقبال اسے اپنے "ریاض سخن کی جان پرور" فضا میں بلاتے ہیں کہ۔

میں باغبان ہوں محبت بہار ہے اس کی بنا مثال ابد پائے دار ہے اس کی

یا مثلاً "انسان اور بزم قدرت میں" بزم قدرت انسان سے کہتی ہے۔

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پے گلزار وجود
انجمن حسن کی ہے تو ، تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

(۴)

حسن و عشق کے متعلق فلسفیانہ نظمیں

اقبال کی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں سے ایک میں محبت کی تعمیر کا نیم شاعرانہ، اور نیم تفکرانہ مطالعہ کیا گیا ہے اور دوسری میں (جس کا خیال جرمن نثر سے لیا گیا ہے) زوال حسن اور کائنات پر اس

زوال کے حزنیہ اثر کا ہلکا سا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں نظموں یعنی "محبت" اور "حسن و زوال" میں خیال گہرا ہے۔ تہ میں ایک مقصد کام کر رہا ہے۔ ان نظموں کی بنیاد واقعات کے تجربے پر رکھی گئی ہے۔ اسی لئے بہت وسیع معنوں میں انہیں فلسفیانہ نظمیں کہا جاسکتا ہے۔

ان میں سے "محبت" میں عشق کی آفرینش کا ایک مخصوص تصور پیش کیا گیا ہے۔ عشق ایک سرمدی راز تھا۔ جو انسان کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ مگر اس مخلوق نے جس میں عبودیت کے ساتھ بغاوت کی صلاحیت، ہمیشہ سے موجود تھی۔ اس راز کو معلوم کر لیا۔ فطرت کی کیفیتوں اور روح خالص کی مختلف خاصیتوں سے یہ نسخہ تیار ہوا۔ تارے سے چمک، چاند سے داغ جگر، رات سے سیاہی، بجلی سے تڑپ، شبنم سے افتادگی لی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی نفسہائے مسیح اور شان ربوبیت سے ادائے بے نیازی کے اثرات لئے گئے۔ اس طرح محبت کی تعمیر ہوئی۔ اور صرف انسان ہی نہیں پوری فطرت اس نور سے جگمگا اٹھی۔

خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چمک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

دوسری نظم یعنی "حسن اور زوال" کا بنیادی تخیل باہر سے لیا گیا ہے۔ مگر پوری نظم یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو خود محسوس کر کے لکھا ہے۔ اس نظم سے دو جداگانہ تحقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ حسن اور زوال، لازم و ملزوم ہیں۔

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

دوسری حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے ہر حسین مظہر کا، زوالِ حسن کا ماتم بھی ہے۔

بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

(۵)

اقبال کی اردو شاعری میں تصوف کی جھلک

حسن اور عشق کے تصور اور تخیل میں اقبال کے پختہ تر زاویہ نظر کا پتہ ان نظموں میں چلتا ہے جن میں ایک عالمگیر حسن یا ایک عالمگیر حقیقی عشق کا تصور، ان کا محرک ہوتا ہے۔ حسن و عشق کی نظموں میں یہ نظمیں سب سے زیادہ بلند ہیں اور ان نظموں سے اس اقبال کا اندازہ ہوتا ہے جو آگے چلکر اسرار خودی، رموز بے خودی، زبور عجم اور جاوید نامہ لکھنے والا تھا۔

مولانا روم کا اثر اقبال پر اسی قدر ہے، جس قدر اثر پلوٹارک کا شکسپیئر پر تھا۔ دنیا کا ہر شاعر ان

کے لئے صرف دیکھ لینے کی چیز ہے ۔ مگر مولانا روم کا اثر ان پر اس قدر چھایا ہوا ہے ۔ کہ بڑی حد تک وہ مولانا کی روشنی میں دنیا کے اہم تر مسائل کو دیکھتے ہیں ۔

" شمع " میں یہ اثر پہلی مرتبہ کھلم کھلا ظاہر ہوتا ہے ۔ اقبال نے زندگی کو سمجھنے کے لئے مشرق اور مغرب دونوں کے فلسفے کا مطالعہ کیا ۔ بہت مدت تک ان کو حقیقت اور سکون کی جستجو رہی ۔ بہت دنوں تک ذوق استفہام ان کو پریشان کرتا رہا ۔ پھر جب ان کو سکون ملا تو تصوف میں ملا ۔ غزالی میں نہیں مولانا روم میں ۔

اس جستجو اور کاوش کا مکمل ترین اظہار " بچہ اور شمع " کے آخری حصے میں ہوا ہے ۔ صرف ظاہری حسن کی نمود شاعر کو تسکین نہیں دے سکی ۔ روح کسی اور سکون کے لئے بیتاب ہے ۔

محفل قدرت ہے ایک دریائے بے پایان حسن
آنکھ اگر ، تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن
حسن کوہستان ، ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی خونگرمی شب کی سیہ پوشی میں ہے
چشمہ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں صحرا میں ، ویرانے میں آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثال ماہی بے آب ہے

اس جستجو کے بعد تسکین نصیب ہوئی تو اس تخیل میں جو مولانا روم نے پیش کیا ۔ " شمع " میں وہ کیفیتیں جو مثنوی معنوی میں معراج کمال کو پہنچ گئی ہیں جابجا منعکس نظر آتی ہے ۔

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق
آواز " کن " ہوئی تپش آموز جان عشق
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
شام فراق صبح تھی میرے نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں

غربت کے غمکدے کے وطن جانتا ہوں میں
یاد وطن نسردگیٔ بے سبب بنی
شوق نظر کبھی ، کبھی ذوق طلب بنی

اے شمع حال قیدی دام خیال دیکھ
مسجود ساکنان فلک کا مآل دیکھ
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کردیا سر دیوان ہست و بود
گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مضمون بلند ہے
چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہور جلوہ ذوق شعور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں
اے شمع میں اسیر فریب نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقہ دام ستم بھی آپ
بام حرم بھی طائر بام حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصہء دار و رسن کہیں

اس نظم میں فطرت کا کوئی منظر اقبال کی نظر کے سامنے نہیں ۔ شمع جو مشرقی شاعری کے لوازمات سے ہے ، ایک نئے نور کے ساتھ ان کے تخیل میں جل رہی ہے ۔ ایک طرف تو وہ اس سے خیرہ کن نور حاصل کر رہے ہیں ۔ دوسری طرف اسے ایک نئی روشنی عطا کر رہے ہیں ۔

اور یہ منزل اقبال کے کلام میں حسن و عشق کے عنصر کی آخری منزل ہے ۔

یہ منزل ان کی شاعری کے پختہ تر مذہب یعنی پان اسلامزم میں جاکر ضم ہو جاتی ہے ۔ اور مشرق کے لئے روحانی پیغام بن کر ان کی فارسی شاعری میں ایک نئی روشنی اختیار کرتی ہے اور اس روحانی پیغام میں

عشق کا تصور وہی ہے۔ جو متصوفین اور سالکین کا تھا۔ مگر بالکل نئے رنگ میں، مغرب سے کامل اکتساب نور کر کے، مغرب کی مادیت کے خلاف اس پیغام کو پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اقبال کی شاعرانہ نفسیاتی نشوونما کی جو منزل آتی ہے اس میں عشق اور علم باہم مل جاتے ہیں "پیام مشرق" "زبور عجم" کے بعض حصوں اور "جاوید نامے" میں عشق اور عمل کے مشترک اور کامل مشرقی تصور سے مشرق کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

محمد افضل الدین

آہ اقبال!

اقبال کی موت ہندوستان اور خصوصاً مسلمانان ہند کے لیے ایک سانحہ عظیم ہے۔ اس نقصان کی تلافی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ ایسا شاعر جس کو تلمیذ الرحمٰن کہا جائے اور جس کی شاعری جزو پیغمبری تصور ہوتی ہو صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے۔

دنیائے اسلام میں دو شاعر ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی شاعری سے حقیقی کام لیا جن کی شاعری نے جذبات سے افسردگی، خیالات سے جمود اور زیست سے خوابیدگی دور کر کے عمل، جوش اور احساس خودی کے جذبات پیدا کر دیئے، جلال الدین رومی اور شیخ محمد اقبال دنیائے ادب کی وہ زندہ جاوید یادگاریں ہیں جن پر اسلامی دنیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فخر کرتی رہے گی۔

اس شخص کا پیغام جو یہ کہتا ہوا جان دے کہ "مسلمان کی نشانی یہ ہے کہ موت آئے تو اسے مسکراتا دیکھے" دلوں سے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا اور ایسی موت جو دوسروں کو زندہ کر دے فنا سے تعبیر نہیں کی جا سکتی بلکہ وہ دنیا میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور یہی وہ بقائے دوام ہے جس کے لیے لاکھوں جتن کیے جاتے ہیں لیکن میسر نہیں آتی۔

اقبال اس اطمینان سے دنیا سے گزر گئے "جیسے کوئی ایک کام ختم کر کے دوسری جگہ جاتا ہے۔" اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس شمع کو فروزاں رکھیں جسے اقبال نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ اگر یہ کام واقعی ہم سے ہو سکا تو گویا ہم نے اقبال کی ایسی خدمت کی جس کی ایک پیشوا اپنی قوم سے توقع رکھتا ہے۔

اردو شاعری جس کا خود اقبال نے اس طرح ماتم کیا تھا۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

انہیں کے ہاتھوں بڑی حد تک سنور چکی ہے، اس وقت اردو ادب میں ایسے سینکڑوں الفاظ ترکیبیں اور بندشیں ہیں جو سب کی سب اقبال کی رہین منت ہیں یہ اقبال ہی کی شاعری تھی جو وطن اور جغرافی حدود سے بلند ہو کر انسانوں کو ایسے منظر پر پہونچا دیا جہاں قومی اور ملی مسایل بالکل نئی روشنی میں دیکھے جانے لگے۔

اقبال کے شعر و فکر کی دنیا میں ایسے بے شمار خیالات ہیں جو ایک مردہ اور مفلوج قوم کو حیات تازہ بخش سکتے ہیں اردو شاعری میں ان کی جگہ اس ممتاز صف میں ہے جہاں میر، غالب، مومن، انیس، اور حالی صف آرا ہیں، ممکن ہے زبان اور قدیم فن شعر کے لحاظ سے میر، غالب، مومن، انیس اور حالی کو اقبال پر ترجیح حاصل ہو لیکن افکار تخیل، ندرت بیان، پیغام بری اور فلسفیانہ بلند پروازی کے لحاظ سے وہ ان سب سے آگے ہیں، ان کی شاعری زندگی ہے اس لیے وہ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک کہ اس دنیائے آب و گل میں حیات کے آثار پائے جائیں گے۔ (اداریہ)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

علامہ اقبال

سینہ تھا ترا مشرق و مغرب کا خزینہ — دل تھا ترا اسرار و معارف کا
ہر شعر ترا بام ترقی کا ہے زینہ — مانند مہ نو تھا فلک سیر

اس ساز کے پردے میں تھی عرفان کی آواز
کیا عرش سے ٹکرائی ہے انسان کی آواز

سچ تلخ تھا لیکن اسے شیریں کیا تونے — تلخابہ غم کو شکر آگیں کیا تو نے
تعلیم خودی دے کہ خدا بیں کیا تونے — کنجشک فرد مایہ کو شاہیں کیا تو نے

پر ٹوٹے تھے جن کے انہیں پرواز عطا کی
گونگے تھے جو انسان انہیں آواز عطا کی

دل تیرا مے عشق سے لبریز تھا ساقی — اور درد کی لذت سے طرب خیز تھا ساقی
قطرہ تری مے کا شرر انگیز تھا ساقی — ہر ساغر ترا گل ریز دگہر ریز تھا ساقی

تف مے پہ جو سنبھلے ہوئے انساں کو گرالے
وہ مے تھی ترے خم میں جو گرتوں کو سنبھالے

وہ عشق جو انسان کی ہمت کو ابھارے — وہ عشق جو دنیا میں بگڑتے کو سنوارے
جس عشق سے اغیار بھی بن جاتے ہیں پیارے — جس عشق کے اشکوں سے فلک پر بنے تارے

وہ عشق تھا تیرے دل و جاں میں مگ د ے میں
جس طرح نشہ مے میں ہے اور نغمہ ہے نے میں

منزل ہی نہیں جس کی کہیں پر وہ ترا شوق — سیارہ گردوں کو نہ ہی تحت نہ ہے فوق
آزادی انساں کا ترے دل میں تھا کیا ذوق — زنجیر علائق نہ توہم کا کوئی طوق

وہ بحر تفکر کہ نہیں جس کا کنارا
سیلاب نہیں ڈھونڈتا ساحل کا سہارا

حکمت ہمیں دی شعر کی صہبا میں ڈبو کر   حق پیش کیا سوز نہانی میں سمو کر
جس نخل کا دنیا میں گیا بیج تو بو کر   اک روز رہے گا وہ فلک بوس ہی ہو کر
رس عشق کا اس نخل کی رگ رگ میں چلے گا
ہر سمت میں وہ پھولے گا پھیلے گا پھلے گا

سمجھایا ہمیں کیا ہے بری چیز غلامی   ہے جس سے زبوں، ہو کوئی گمنام کہ نامی
محکوم ہے تو، تو تری فطرت کی ہے خامی   آزادی افکار سے انساں ہے گرامی
آزاد ہی دنیا میں ہے اللہ کا شہکار
ہر بندہ آزاد ہے تقدیر کا معمار

ہندی تھے غلامی کے نشے میں بھی مدہوش   تھے سر پہ رکھے فخر سے اغیار کی پاپوش
حیوانوں کا مقصد تھا فقط خواب و خورونوش   بے عزت و بے غیرت و بے ہمت و بے جوش
رسوائی میں جو مست تھے ہشیار ہوئے ہیں
صدیوں سے جو سوتے تھے وہ بیدار ہوئے ہیں

ڈھانچا جو غلط تھا تہ و بالا کیا تو نے   دنیا کے اندھیرے میں اجالا کیا تو نے
اس قوم میں کیا کام نرالا کیا تو نے   منہ جھوٹ کا اور مکر کا کالا کیا تو نے
تہذیب و سیاست کی طلسمات کو توڑا
سچائی سے ہر جھوٹی کرامات کو توڑا

اقبال! تو پیغامبر عشق و عمل ہے   انساں کی ترقی کا یہ قانون اٹل ہے
یہ نغمہ جاوید ہے یہ ساز ازل ہے   ہاں زیست کی مشکل کا فقط ایک حل ہے
جاں صرف عمل اور ہو دل عشق سے لبریز
اٹھتا ہے یونہی جادہ ہستی میں قدم تیز

عاقل تھا مگر عقل کے پیچاک سے آزاد　　اور حکمت افرنگ کے فتراک سے آزاد
دنیا میں تھا دنیا کے غم و باک سے آزاد　　خاکی تو وہ بے شک تھا مگر خاک سے آزاد
ہے دل کی جگہ دور کہیں ارض و سما سے
ہوتا ہے جہاں بندہ ہم آغوش خدا سے

ہادی ہے وہ انسان کو جو آگے کو بڑھا دے　　تاریکی میں انسان کے ہاتھوں میں دیا دے
جو عقل پہ پردے ہیں پڑے ان کو ہٹا دے　　صیقل کرے آئینہ دل اس کو جلا دے
ہر قلب کو تقدیر حقیقی نظر آئے
اور آنکھ کو تصویر حقیقی نظر آئے

اقوام ہوں جس بانگ سے بیدار وہ پیغام　　انسان ہوں مئے عشق سے سرشار وہ پیغام
ہو بار امانت سے گراں بار وہ پیغام　　ہر روح حقیقت سے ہو دوچار وہ پیغام
وہ جوش کہ انسان ابھر جاتے ہیں جس سے
کھوٹے بھی کھرے بن کے نکھر جاتے ہیں جس سے

کہتے ہیں سخنور کہ تھا شاہ سخن اقبال　　ظاہر میں فقط شعر میں تھا اہل فن اقبال
ہے اصل حقیقت یہ کہ تھا بت شکن اقبال　　مولا کو وطن کہتا تھا یہ بے وطن اقبال
اس جسم میں تھا روح کی معراج کا طالب
انسان کے لئے دل کے سوا راج کا طالب

عارف کی نظر اپنے وطن تک نہیں محدود　　کیوں اس کی نظر ہو در و دیوار میں مسدود
گو حب وطن اس میں تھی اک جذبہ محمود　　اقبال نے دھرتی کو بنایا نہیں معبود
خاکی جو نہیں کرتا ہے افلاک کی پوجا
کس طرح سے کر سکتا ہے وہ خاک کی پوجا

عارف کی نظر گاہ ، وہی اس کا وطن ہے　　پورب ہے نہ پچھم ہے نہ اتر نہ دکن ہے
ندی کوئی اس میں ہے نہ پربت ہی نہ بن ہے　　نے دیر و حرم کی کوئی تعمیر کہن ہے

نے شرق کا گرویدہ نہ افرنگ کا عاشق
کس طرح سے ہو وہ جمن و گنگ کا عاشق

کم کوئی ہے اس غمکدہ دہر میں آیا جس نے وطن اپنا دل انسان میں بنایا
انسان کی توقیر کا وہ راگ ہے گایا موسیقی جاں بن کے جو جانوں میں سمایا

یہ راگ ہے وہ کون و مکاں ساز ہے جس کا
روحوں میں نہاں اور عیاں راز ہے جس کا

تو شیخ سے بیزار برہمن سے بھی بیزار نے اس کا پرستار نہ تو اس کا گرفتار
دولت کا شکار اور نہ سیاست کا گنہگار افکار سے مستقبل اقوام کا معمار

جن ابلہ فریبوں میں ہے مکتی کا اجارہ
تعلیم سے تیری ہے بہت ان کو خسارہ

ہر شعر سے اٹھتا ہے سدا نعرہ تکبیر خوں تیری سیاہی ہے قلم تیری ہے شمشیر
اشعار ترے کاتب تقدیر کی تحریر آئینہ بکف جس میں ہے اقوام کی تقدیر

مغرب ترے شعر ہیں ، انسان کا دل ، ساز
فطرت ترے نغموں پہ رہی گوش بر آواز

یہ شعر ہے کہتے ہیں جسے جز و نبوت یہ شعر ہے شاگردی رحمٰن کی آیت
یہ شعر بدل دیتا ہے انسان کی حالت اس شعر میں ہے عالم لاہوت کی دولت

یہ شعر حقیقت میں ہے پروردہ الہام
نعمت ہے بہت خاص مگر فیض بہت عام

جس کا ہو کلام ایسا کلیم اس کو ہیں کہتے حکمت سے ہو لبریز حکیم اس کو ہیں کہتے
افکار کی جنت ہے نعیم اس کو ہیں کہتے اے صاحب دل ! طبع سلیم اس کو ہیں کہتے

انسان ہے اللہ کا معشوق اسی سے
خاکی پہ ہوا اشرف مخلوق اسی سے

اقبال کے ہیں شعر، سخنداں کی زبان پر اقبال کے اقوال ہوئے نقش ہیں جاں پر
اقبال کے ہیں تیر سیاست کی کماں پر تیغوں کو جلا دیتے ہیں اس سنگ فساں پر
اقبال نے رنگ اپنا ادیبوں پہ چڑھایا
رنگ اپنی خطابت کا خطیبوں پہ چڑھایا

اب دل میں ہے ہر ایک کے پیدا وہی انداز اب قوم کی آواز بنی ہے تری آواز
الفاظ میں تیرے ہے کوئی سحر کہ اعجاز بجتا ہے ہر اک رنگ کی محفل میں وہی ساز
اشعار ترے پیرو جواں سب کو ہیں ازبر
محفل کی ہیں رونق تو کہیں گرمی منبر

تھے صاحب دل رومی و عطار و سنائی تھی جن کی خودی آئینہ راز خدائی
لے عالم ارواح کی انساں کو سنائی کچھ لذت وصل اس میں ہے کچھ درد جدائی
ایسے ہی فقیروں کا ہم آہنگ تھا اقبال
مردان خدا دوست کا ہم رنگ تھا اقبال

انسان کا کیا قحط ہے اس دیر کہن میں قرنوں ہی میں آتا ہے اویس ایک قرن میں
سمجھائے انہیں کون جو یاں مست ہیں دھن میں دولت جو حقیقی ہے وہ انساں کے ہے من میں
اس دولت سرمد کا شہنشاہ تھا اقبال
فطرت کی گواہی ہے حق آگاہ تھا اقبال

کام ایسا جو کرتا ہے وہ مرتا نہیں ہرگز ایسے جو جئے موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
دنیا سے گیا، دل سے گزرتا نہیں ہرگز اس صفحہ سے یہ نقش اترتا نہیں ہرگز
جب تک کہ دل افروز یہ پیغام ہے باقی
عالم کے جریدے پہ ترا نام ہے باقی

محمد علی نیرؔ

شاعر مشرق

قیامت ہے ہوا پنہاں کفن میں شاعر مشرق
رہے گا یاد صدیوں تک وطن میں شاعر مشرق

سنا جب ہوگیا دنیا سے رخصت شاعر اعظم
مری دنیاے دل کا اور ہی کچھ ہوگیا عالم

جگایا تھا نوائے آتشیں سے کاروانوں کو
کیا تھا گامزن راہ عمل پر نوجوانوں کو

اخوت اور ملت کا نرالا پاسباں وہ تھا
رموز حریت کا بے بدل اک رازداں وہ تھا

پیام حریت اس نے دیا ہندی غلاموں کو
کہا زندہ کرو اپنے سلف کے کارناموں کو

ہمارے دل میں اس نے شعلہ غیرت کو بھڑکایا
سناکر عہد ماضی کا ترانہ سب کو تڑپایا

نہ بھولیں گے کبھی ہم اس کے زریں کارناموں کو
دیا درس خودی اس نے جہاں کے رہنے والوں کو

الٰہی پھر کوئی اقبال سا آتش نوا نکلے
وطن کی خاک سے پھر کوئی ایسا رہنما نکلے

جدائی پر تری ماتم کناں ہے مادر گیتی
مگر شاداں ہوا ہے مل کے تجھ سے خالق ہستی

نہیں مٹ سکتا اے اقبال تیرا نام ہستی سے
حیات جاوداں تجھ کو ملی ملت پرستی سے

مئے علم و عمل کا دور ہوگا تا ابد ساقی
حیات دائمی کی شکل میں اقبال ہے باقی

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اقبال کی زندگی کے مختصر حالات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کی زندگی کا بہت قریبی اور گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ آپ دونوں کے بڑے دوستانہ تعلقات رہے ہیں اور بعض وقت گھنٹوں دونوں نے مبادلہ خیالات کیا ہے ۔ یہ ملاقاتیں یقیناً بے حد دلچسپ رہی ہوں گی کیوں کہ اقبال کی طرح ڈاکٹر صاحب کو بھی شعر و فکر کی نعمتیں ودیعت کی گئی ہیں ۔ دونوں کے زاویہ نظر ایک دوسرے سے بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ دوستی آگے چل کر عقیدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے ۔

انھیں تمام باتوں کے پیش نظر میں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی تھی کہ مجلے کی اس اشاعت کے لیے اقبال کی زندگی پر کوئی مضمون عنایت فرمائیں ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ان دنوں اس قدر مصروف تھے کہ ان کے لیے کوئی مستقل مضمون کا لکھنا دشوار تھا چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے یہی عذر کیا ۔ اس پر میں نے اس کی اجازت چاہی کہ چھٹیوں میں ڈاکٹر صاحب میرے لیے اتنا وقت نکال لیں کہ وہ حالات بیان کرتے جائیں اور میں انھیں قلم بند کرتا رہوں ۔ ڈاکٹر صاحب اس پر راضی ہو گئے اور یہ مضمون جو آپ کے زیر نظر ہے اسی طرح تیار ہوا ہے ۔

کبھی کبھی میرے لیے ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا بجنسہ قلم بند کرنا دشوار ہو جاتا اور میں اشارے لیتا جاتا تھا ۔ لیکن گھر جاتے ہی اپنے حافظے کی مدد سے عبارت کو مکمل کر لیتا تھا ۔ اس مضمون میں پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ وہی الفاظ اور جملے رہیں جو خلیفہ صاحب نے ارشاد فرمائے تھے ۔ البتہ کہیں کہیں یہ "سرد لبراں" "حدیث دیگراں" ہو گیا ہے ۔

افضل

علامہ سر محمد اقبال ۱۸۷۲ء ، میں بہ مقام سیال کوٹ پیدا ہوئے ، سیال کوٹ ایک نہایت مردم خیز خطہ ہے ۔ گوشتہ صدیوں میں بھی یہاں سے بعض ایسے صاحب کمال پیدا ہوئے جن کا نام تمام دنیائے اسلام میں آج تک بڑی عزت سے لیا جاتا ہے ۔ ملا عبدالحکیم ، سیال کوٹی جو شاہ جہاں کے زمانے میں تھے اور جن کو

ان کی مشہور تصنیف کے صلے میں چاندی میں تولا گیا تھا۔ یہیں کے رہنے والے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ سیال کوٹ کے مردم خیز ہونے کا ذکر علامہ اقبال سے کیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کے لیے تاریخ میں سے ایسے کئی باکمالوں کے نام گنوائے جو اس سرزمین سے اٹھے تھے۔ سیال کوٹ کا علاقہ کشمیر کی ریاست سے بالکل ملحق ہے اور بڑی کثرت سے کشمیری خاندان اس میں آباد ہیں، اقبال کے آباواجداد بھی کشمیر ہی سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ ان کے اسلاف کشمیری پنڈت تھے جن کی ذات سپرو تھی۔ مجھے ان کے سپرو ہونے کا علم خود انہی کی زبانی حاصل ہوا۔ سر بیج بہادر سپرو اپنی علم دوستی کی وجہ سے اقبال کے بڑے قدر دانوں میں ہیں، خود صاحب موصوف کی زبانی اس کا پتہ چلا کہ غالباً چار یا پانچ پشت اوپر اقبال اور سپرو ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد ایک نے اسلام قبول کر لیا اور اختلاف مذہب کی وجہ سے اس خاندان کی مختلف شاخیں ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئیں۔

اگرچہ اسلام کے زیر اثر اقبال ذات پات اور نسل پر افتخار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے تاہم جابجا ان کے اشعار میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ ان کو اپنے برہمن زادہ ہونے پر بھی فخر تھا۔ برہمنوں کی ذہانت اور فلسفہ دانی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور غالباً از روئے قانون توارث اقبال کو اس میں اچھا خاصا حصہ ملا۔

اقبال کے والد گو صاحب ثروت نہ تھے لیکن اپنے شہر میں دل و دماغ کی پاکیزگی کی وجہ سے بہت قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ کوئی بیس برس کا عرصہ ہوتا ہے جب کہ انار کلی والے مکان میں مجھے ان سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اس وقت اقبال کی شہرت تمام ملک میں پھیل چکی تھی اور ان کے والد اقبال کے کمال پر بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ ان پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہی رنگ اقبال میں علم و شعر کے جوہروں کے ساتھ مل کر اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا اور اسی کی بدولت اقبال کو عطار، سنائی اور رومی کی صف میں جگہ ملی۔

اقبال کبھی کبھی اپنے والد کے کشف و کرامات بھی بیان کرتے تھے، فرماتے تھے "میں نے والدہ کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ہوا اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے" اقبال کے والد کی گفتگو میں نہایت لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی تھی۔ وہ ایک مرتبہ فرماتے تھے۔ "اقبال کی پیدائش کے کچھ روز پہلے میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے، اس ہجوم میں میں بھی ہوں، وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آ کر گرا اور میں نے اسے پکڑ لیا" فرماتے تھے "میں نے اس کی اقبال کی پیدائش کے بعد یہی تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا"۔

جس کسی کو ان سے ملنے کا موقع ملا ہو اس کو قطعاً اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ اقبال کو اپنی طبعیت کے بہترین عناصر اپنے باپ ہی سے بچپن میں ملے۔ فارسی کی ایک نظم میں بھی اپنے والد کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ "میں نے ایک مسئلہ کو بری طرح ڈانٹا والد سن رہے تھے انھوں

نے اس وردانگیز طریقے سے میری اس درشتی پر سرزنش کی کہ اس کے بعد سے آج تک میں کبھی کسی سائل کے ساتھ کسی قسم کی سخت کلامی نہیں برت سکتا۔"

اقبال کو اپنی والدہ سے بھی بہت محبت تھی جس کا ثبوت اس بلیغ اور دردانگیز مرثیے سے ملتا ہے جو انھوں نے اپنی والدہ کی وفات پر لکھا ہے جس کا ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار ؟
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار ؟
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزّت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
دو جواں قامت میں ہے جو صورت سرو بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تیری تصویر ، وہ بازو مرا
تجھ کو مثل طفلک بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا ، صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

اقبال کو جس زمانے میں اپنے اندر گہرے وجدانی رجحان کا احساس شروع ہوا تو ایک روز انھوں نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا "میں اپنے اندر کچھ ایسی چیزیں محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھ میں بعض جسمانی کمزوریاں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی کسی نہ کسی قسم کا نبی ہو جاتا" اس پر ان کے والد نے ہنس کر کہا "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اپنی کمزوریوں کا علم ہے جو تم کو اس مغالطے میں پڑنے سے بچاتی رہیں گی۔

انٹرمیڈیٹ تک ان کی تعلیم سیال کوٹ میں ہوئی، خوش قسمتی سے اردو، فارسی اور اسلامیات کے ذوق کی تربیت کے لیے ان کو ایک ایسے استاد سے تلمذ حاصل ہوا جو اپنے زمانے کے بے نظیر شخص تھے

مولوی میر حسن بڑے عالم اور سخن فہم شخص تھے اساتذہ کا کلام ان کو بڑی کثرت سے یاد تھا۔ جو ذوق سخن ان کی طبعیت میں تھا اس کو وہ ہونہار شاگردوں میں بھی منتقل کر دیتے تھے۔ کچھ اپنے میلان فطرت کی وجہ سے اور کچھ مولوی میر حسن کے فیض صحبت ..... کی وجہ سے جوانی کے زمانے میں اقبال کا یہی حال تھا کہ اساتذہ کے ہزارہا اشعار ان کو یاد تھے۔

سیال کوٹ کا اسکاچ مشن کالج غالباً اس زمانے میں ایف۔ اے تک محدود تھا اسی لیے بی۔ اے کی تعلیم کے لیے اقبال لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے وہیں سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں بڑے امتیاز سے حاصل کیں۔

اس زمانے میں اقبال کی خوش قسمتی سے آرنلڈ وہاں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ آرنلڈ کو فلسفے کے علاوہ ادبیات کا بھی ذوق تھا اور اسلامیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جس قدر اقبال آرنلڈ کے شاگرد ہونے پر خوش تھے آرنلڈ اقبال جیسے طباع اور ذہین شاگرد کی استادی پر فخر کرتے تھے آرنلڈ کا بیان تھا کہ ایسے طالب علم کے پڑھانے سے خود استاد کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایم۔ اے میں فرسٹ آنے کے صلے میں اقبال کو نانک بخش مڈل ملا اس کے بعد وہ کچھ عرصے اورنٹیل کالج اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر بھی رہے۔ جب پروفیسر آرنلڈ ولایت جانے لگے تو اقبال کو اپنے ساتھ چلنے پر بہت مجبور کیا۔

اقبال کی انگلستان کو روانگی۔

اقبال کے اس سفر یورپ میں ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے جو ابھی بقید حیات ہیں ان کی بڑی مدد کی شیخ صاحب کی آمدنی اگرچہ محدود تھی لیکن ان کو اپنے چھوٹے بھائی سے ایسا عشق تھا کہ انھوں نے اپنا تمام سرمایہ بے دریغ ان کے حوالے کر دیا۔ اقبال بھی جب اپنے بھائی کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی معشوق کا ذکر کر رہے ہیں۔ دونوں بھائیوں کا یہ گہرا عشق آخر عمر تک بدستور قایم رہا۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں عازم انگلستان ہوئے لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنی چند نظموں کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے جو نظمیں انھوں نے انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں پڑھیں یا سر عبد القادر کے مخزن میں شائع ہوئیں وہ ایسی بلند پایہ نظمیں تھیں کہ ہر سخن فہم کو احساس ہو گیا تھا کہ آسمان شعر پر ایک نیا آفتاب طلوع ہوا ہے۔

انگلستان میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے زیادہ تر ان کا تعلق پروفیسر ڈارڈ اور سارلے سے رہا یا پروفیسر براون سے پروفیسر نکلسن سے کیمبرج میں میں نے دریافت کیا تھا کہ آیا طالب علمی کے زمانے میں وہ اقبال کو جانتے تھے انھوں نے فرمایا" نہیں میں اس زمانے میں ان سے واقف نہ تھا؟"

انگلستان کے دوران قیام میں مغربی فلسفے کے علاوہ اقبال نے اسلامی فلسفے کی طرف رجوع کیا اور بڑی تحقیق سے اسلامی تعلیمات کے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کا حاصل وہ مقالہ ہے جو

Metaphysi es in Persia کے نام سے شائع ہوا۔ اس مقالے کی بناء پر میونخ یونیورسٹی سے ان کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی، لندن میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ کے قایم مقام کی حیثیت سے وہ کچھ عرصہ لندن میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ انگلستان کے زمانہ قیام میں انھوں نے (۶) لکچر اسلام پر بھی دیئے۔

واپسی

۔ ۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس لوٹے علمی شوق کی وجہ سے زیادہ موزوں بات تو یہی تھی کہ وہ پروفیسر ہوتے لیکن کسی وجہ سے انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ملازمت نہ کریں گے۔ اس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سرویس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا یہ سرویس زیادہ تر انگریزوں کے لیے مخصوص تھی لیکن اقبال کے علم کا چرچا اس وقت بھی ایسا تھا کہ خود گورنمنٹ نے ان کے سامنے یہ خدمت پیش کی لیکن اقبال نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں کو بڑا افسوس تھا کہ انھوں نے ایسا نادر موقع ہاتھ سے کیوں کھو دیا۔ جسٹس شاہ دین مرحوم اس زمانے میں ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس بارے میں وہ اقبال سے بہت ناراض تھے اور ان سے ہمیشہ کہتے تھے تم جیسے آدمی کا عدالت میں کوئی کام نہیں، تمہیں علمی زندگی کو بطور پیشے کے اختیار کرنا چاہیئے، میں نے ان سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ "آیا یہ بہتر نہیں تھا کہ آپ پروفیسر ہو جاتے؟" فرمانے لگے۔ "میں نے کچھ دن پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہونچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں" فرماتے تھے "ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ اپنے اسی خیال کو انھوں نے اسرار خودی میں بیان کیا ہے۔

رزق خویش ازدست دیگر الخدر
الخدر از نان چاکر الخدر

انگلستان کے دوران قیام میں قومی احیاء کے خیالات ان کی طبیعت میں موج زن ہونے لگے تھے وہاں انھوں نے جو نظمیں لکھیں ان سے انھیں خیالات کا پتہ ملتا ہے۔

ہر شاعر جو دیگر کمالات کی بھی اہلیت رکھتا ہو کبھی کبھی شاعری کو لاطایل بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اقبال کو انگلستان میں خیال ہوا کہ مسلمانوں میں شاعری انحطاط کے ساتھ وابستہ ہے اور اس قوم کو مزید شاعری کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ شاعری چھوڑ دیں گے اور کوئی ایسا کام کریں گے جس سے قوم میں بیداری اور قوت عمل پیدا ہو اس وقت تک ان کو اس کا پوری طرح احساس نہیں ہوا تھا کہ شاعری کا رخ بدل کر بھی یہ کام بہ طریقہ احسن اس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں سر عبد القادر بھی انگلستان ہی

میں تھے اور دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ سر عبد القادر کو اس کا خطرہ ہوا کہ کہیں سچ مچ اقبال شاعری ترک نہ کر دیں، اس معاملے میں دونوں میں بحث ہو گئی اور فیصلہ یہ ہوا کہ پروفیسر آرنلڈ سے مشورہ کیا جائے اور اس کے بعد قطعی فیصلہ کیا جائے۔ دنیائے ادب کے لیے یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ آرنلڈ نے ان کو نہایت صحیح مشورہ دیا اور ان سے کہا کہ بلند پایہ شاعری سے قوم کا ایسا تعمیری کام ہو سکتا ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس پر اقبال کچھ نرم پڑ گئے اور ان کا وہ خیال رفتہ رفتہ جاتا رہا لیکن اس کے ساتھ یہ ارادہ بھی کیا کہ شاعری کو محض تفنن طبع کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اس کی تمام قوت قوم کے اندر صحیح جذبات کے بیدار کرنے کے لیے صرف کی جائے۔

انگلستان سے واپسی پر اقبال بیرسٹری کے پیشے میں اپنے آپ کو استوار کرنے لگے۔ اگرچہ ان کو اپنی ذہانت، محنت اور شہرت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا تھا لیکن دیر تک ان کو یہ پتہ نہ چلا کہ ان کی بیرسٹری ان کی شاعری میں حائل ہے اور ان کی شاعری ان کی بیرسٹری میں مزاحم، عمر کا ایک نہایت ہی قیمتی حصہ انھوں نے اس پیشے پر ضائع کیا۔ میں نے ان سے ایک مرتبہ کہا "آپ نے یہ دو متضاد سے شغل کیوں اختیار کر رکھے ہیں؟" فرمانے لگے "اس تضاد سے بہت فائدہ پہونچتا ہے۔ وکالت دنیاداری کا نچوڑ ہے۔ تمام جہاں کی کثافتوں اور خباثتوں سے انسان اس پیشے میں آشنا ہو جاتا ہے اور طبیعت میں اس کے خلاف ایک ایسا ردعمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روح لطیف چیزوں کے حصول کے لیے بال و پر پھیلاتی ہے۔ اس پر انھوں نے یورپ کے بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو شاعر بھی ہیں اور بیرسٹر بھی۔ اقبال کے انتقال کے بعد مجھے ان کا یہ فرمانا یاد آیا کیوں کہ جس اخبار میں ان کی خبر انتقال درج تھی اس میں ساتھ ہی یہ خبر بھی تھی کہ اسی روز سر ہنری نیو بولٹ انگلستان کے مشہور، شاعر بیرسٹر کا بھی انتقال ہو گیا دونوں کی خبر وفات ٹائمس میں ساتھ ہی ساتھ چھپی تھی۔

جتنی مدت اقبال بیرسٹری کرتے رہے عام علمی مشاغل ان سے نہیں چھوٹے، وقتاً فوقتاً وہ شعر بھی کہتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ اس شغل کے لیے وہ اتنا ہی وقت دے سکتے تھے جتنا اپنے پیشے کے مشاغل سے بچ جاتا۔ قانون کی کتاب وہ اہم مقدمے کی تیاری ہی کے وقت دیکھتے ہوں گے کیوں کہ سیکڑوں ملاقاتوں میں میں نے ان کو اکثر فلسفے، ادب تاریخ اور مذہب وغیرہ کی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھا لیکن کبھی قانون کی کتاب ان کے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔

بیرسٹری کے بہترین زمانے میں بھی ان کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپئے سے متجاوز نہیں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت ریاست کے بعض عہدے داروں کا خیال ہوا کہ اقبال کو بطور پرنسپل کے یہاں بلایا جائے میں نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ اس کے خواہش مند نہیں تھے فرماتے تھے۔ "تنخواہ کے لحاظ سے تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر تھوڑی سی رقم مجھے زاید مل بھی جائے تو اس کے لیے جلاوطن ہونا کوئی معقول فعل نہیں۔

اس زمانے میں وہ بڑی کثرت سے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات میں ممتحن

بنائے جاتے تھے سینکڑوں جوابی بیاضوں کے پلندے ان کے پاس پڑے رہتے تھے ۔ امتحانوں کے پرچے دیکھنے کا کام کچھ ایسا میکانکل ہو جاتا ہے کہ وہ بیاضیں پڑھتے بھی جاتے تھے اور ہم نشینوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پرچوں کو غور سے نہیں دیکھتے تھے ۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ذمے اول تو کوئی کام کے لینے سے بہت گریز کرتے تھے لیکن اگر کوئی کام اپنے ذمے لیتے تھے تو اس میں پوری کوشش صرف کرتے تھے ۔

(۲۰) برس سے زیادہ عرصے تک بیرسٹری اور شاعری کا ملا جلا مشغلہ جاری رہا ۔ اس زمانے میں عام قاعدہ تھا کہ ہر پلیڈر لیڈر بننے کی کوشش کرتا تھا جس کی طرف اکبر الہ آبادی نے ظریفانہ اشاعرہ کیا ہے ۔

موکل چھٹے ان کے پنجے سے جب تو پھر قوم مرحوم کے سر ہوئے
پہیے پکارا کئے " بی کہاں " ! مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

اقبال کی سلامتی طبع کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ اس لالچ میں نہیں آئے ان کو پبلک لائیف میں گھسیٹنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اس سے گریز کرتے رہے ۔ اس زمانے میں سیاسیات کا جو رنگ تھا اقبال کو اس میں غلامانہ سیاست کی بو آتی تھی اور وہ کہتے تھے " جب تک صورت حال یہی ہے تو لیڈر کسی قدر قوم فروشی ہی کے ساتھ پنپ سکتے ہیں " جس کے لیے وہ اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں پاتے تھے اس کیفیت پر انھوں نے وہ نظم لکھی ہے جس میں انھوں نے لیڈری کا نقشہ کھینچا ہے ۔

میں نے اقبال سے از راہ نصیحت یہ کہا
عامل روزہ ہے تو ، اور نہ پابند نماز
تو بھی ہے شیوہ ارباب ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس ، لب پہ ترے ذکر حجاز
ختم تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے
فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردہ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریک تگ و تاز

غرض اس تمام نظم میں انھوں نے لیڈروں کے اخلاق کا ایک خاکہ کھینچا ہے ۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ سب کمال اور کم زوریاں مجھ میں بھی موجود ہیں چاہوں تو اچھا خاصا لیڈر ہو جاؤں لیکن ایک بڑے ضروری عنصر

کی کمی ہے۔ فرماتے ہیں۔

سن کے کہنے لگا اقبال ۔۔ بجا فرمایا
شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
" مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر
ہے کمی ایک ، کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز
" ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

۱۵، ۲۰ برس تک اسی خیال پر قایم رہنے کے بعد آخر سیاسی حالات کے انقلاب اور بعض احباب کی ترغیب نے ان کو اس میدان میں گھسیٹا، اس کے بعد وہ پنجاب کی اسلامی سیاست میں پیش پیش رہے، مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ بھی ہوئے مسلم کانفرنس کی روح رواں بھی رہے اور پنجاب کونسل کے ممبر بھی ہوئے میں نے ان سے ایک روز مذاق سے کہا کہ " کیوں جناب! آپ تو کونسلوں کو سرمایہ داروں کا اکھاڑا کہتے تھے۔ اب خود اس میں کیسے شریک ہوگئے ؟" فرمانے لگے " جو کہتا تھا وہ ٹھیک تھا، میں اسی لیے شریک ہوا ہوں کہ اندر سے اس کی بیخ کنی کی جائے۔

کچھ سال کے تجربے کے بعد ان کو محسوس ہوا " میں عملی سیاست کا مرد میدان نہیں بن سکتا مجھ کو اس سے بلند تر کام کرنا چاہیئے اور شعر کے ذریعے ایک طرف تو قوم کے دلوں میں تغیر پیدا کرنا چاہیئے اور دوسری طرف لیڈروں کی طبیعتوں کی باگ خاص نصب العین کی طرف موڑنی چاہیئے۔

اقبال زندگی کے کسی شعبے میں بھی عملی آدمی نہیں تھے افکار و تاثرات نے ان کی تمام شخصیت پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمانوں میں چوں کہ قحط الرجال ہے اس لیے یہ قوم ایک ہی انسان سے مختلف اور متضاد تقاضے کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ایک شخص شاعر بھی ہو، فقیر بھی ہو، قومی لیڈر بھی ہو اور پیر و مرشد بھی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ " ہر کسے را بہر کارے ساختند " ہر اہل کمال کسی خاص ہی صنف میں کمال رکھتا ہے اور دوسری سمتوں میں اس کی استعداد اوسط سے بھی گر جاتی ہے، ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر اقبال کے اشعار سے اپنی روحوں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور اس کے اشعار کے پیدا کیے ہوئے جوش کو عمل میں تبدیل کرتے تھے، ان میں سے بعض لیڈر جو شاعر کی نفسیات سے واقف نہیں تھے اقبال پر طعنہ زن ہوتے تھے کہ " تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر ہی رہے " ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا۔ اقبال نے جواب دیا " سنو بھائی! تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے ہو حق کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں مضطرب ہوتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے ہیں لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں ؟ " اس بیان میں اقبال نے بڑے ظریفانہ انداز میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح فطرت میں

تقسیم عمل ہے اس طرح افراد میں بھی تقسیم عمل ہونی چاہیئے۔

سیاست اور وطن پرستی

۔ جہاں تک سیاسی افکار، تاثرات اور نصب العین کا تعلق ہے اقبال کی سیاست کے (۳) پہلو تھے، ایک طرف تو وہ تمام بلند پایہ مفکرین، مصلحین کی طرح تمام نوع انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انسانی زندگی کے نصب العین سے تعلق رکھتا ہے اور براہ راست ملکی سیاست سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے، محض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے اعلی درجے کے شاعر، حکیم یا نبی مخصوص گروہوں کو اپنی نظر گاہ نہیں بناتا، اقبال ہی کے مماثل جرمنی کا سب سے بڑا شاعر اور مفکر گویٹے ہے جس کا زمانہ جرمنی کا وہ پرآشوب زمانہ تھا جس میں نپولین نہ صرف جرمنی کو بلکہ تمام یورپ کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ گویٹے اس تمام ہنگامے سے کچھ ایسا بے تعلق معلوم ہوتا تھا کہ بعض نقادوں نے اس کو متہم کیا ہے کہ اس میں جذبہ حب الوطنی کی کمی تھی اس قسم کی تنقید کوتاہ نظری ہی پر مبنی ہو سکتی ہے وہی گویٹے جس نے براہ راست اس وقت کی عملی سیاست میں نہ قلم سے حصہ لیا اور نہ عمل سے اپنے افکار کی بدولت جرمنی کی علمی اور تہذیبی عظمت کا بانی ہے۔ اقبال کے متعلق بھی صورتحال اسی قسم کی ہے اس نے شروع میں حب وطن کے عام جذبات کے ماتحت بڑی پرجوش نظمیں وطن پر لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی ہندوستانی شاعر نہیں لکھ سکا لیکن اس دور کے بعد اس کی نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہوئی لیکن وطن سے بلند ہو گئی اور وہ اس نقطہ نظر پر آگیا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی قوم میں تغیر حقیقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس قوم کے نفوس میں تغیر پیدا نہ ہو۔ سیاست داں کی نظر فقط ظاہر پر پڑتی ہے اور وہ فقط سطحی تغیرات کی ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے لیکن حقیقی مصلح کی نظر اساسیات پر پڑتی ہے اور سیاست داں کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع اور دوررس ہوتی ہے۔ سیاست داں محض ابن الوقت ہوتا ہے اور معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی جاتی ہیں ان کو سلجھانے کے لیے وہ قاعدے اور قانون بناتا رہتا ہے جن کی تہہ میں کوئی پائیدار حقیقت نہیں ہوتی۔ اقبال کو یہ خیال ہوا کہ وطن کے متعلق کورانہ جوش کو ابھارنے کا وہی نتیجہ ہوگا جو مغرب نے جابجا حب الوطنی سے پیدا کیا ہے، جغرافیائی حدود کی پرستش سے انسان کی نظر تنگ، اس کی عقل بہانہ جو اور اس کا دل حقیقی عشق سے محروم ہو جاتا ہے لہذا وہ اہل وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا جس میں محض یورپ کی حب الوطنی کی تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ صالحانہ جدوجہد سے سب کے لیے کھل جائے، وطن کی صحیح محبت اس کے دل میں آخر تک موجود تھی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا، آخر تک اپنی فارسی نظموں میں جہاں کہیں وہ ہندوستان کا ذکر کرتا ہے اس کے بیان میں بڑا درد اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھا اور وطن کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، عقلی، مذہبی اور اخلاقی غلامی سے بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی سیاست کا دوسرا پہلو اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ وہ صرف ہندی ہی نہیں بلکہ ہندی مسلمان تھا۔ اس

نقطہ نظر میں وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ تھا جہاں تک سیاست کا تعلق گروہوں کی اصلاح اور ارتقاء سے ہے وہ جس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کے لیے اعلیٰ درجے کے اقتدار کا آرزو مند تھا، اسی طرح وہ تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا ممتنی تھا۔

ہندوستان کے بعض غیر مسلم حضرات مسلمان کی اس فطرت سے آشنا نہیں ہیں چنانچہ جب کوئی مسلمان ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کے متعلق دل چسپی یا جوش اور جذبے کا اظہار کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتا اور وطن پرست یا قوم پرست نہیں ہے۔ ہر صحیح الفطرت مسلمان ہندوستان کی پستی سے اتنا ہی دل گیر ہے جتنا کہ اور کوئی غیر مسلم ہندوستان کی عزت اس کی عزت اور ہندوستان کی ذلت اس کی ذلت ہے اس کا وجود خاکی اسی زمین سے ابھرا اور اسی میں پیوند ہو جائے گا لیکن اسلام نے اس کو ایک ایسی برادری کا بھی رکن بنا دیا ہے جو جغرافیائی حدود سے ماوراء ہے مراکش اور چین کے مسلمان کی سیاسی اور تمدنی کشمکش کے ساتھ بھی اس کے دل کو وہی رابطہ ہے جو خود اپنے وطن کی جدوجہد سے ہے۔

مسلمان کی وسعت قلب میں وطن کے لیے ایک نہایت عزیز مقام موجود ہے لیکن وطن سے ماوراء دنیا کی عالم گیر اسلامی برادری کو بھی وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتا۔ جب تک اسلام کے نصب العین میں کوئی قوت باقی ہے۔ ہر سلیم القلب ہندی مسلمان کی طبیعت میں یہ دونوں جذبے بہ یک وقت موجود رہیں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ دوسرے کے منافی ہے۔ اب ہندوستان کے غیر مسلم، وسیع النظر رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی سیاست میں یہی نقطہ نظر اختیار کر لیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو کوئی ہندوستانی سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی صحیح راہ عمل پیش کر سکتا ہے جب تک کہ باقی اقوام کی سیاست کو بھی ساتھ ملا کر اس پر غور نہ کیا جائے جس زمانے میں مسٹر گاندھی اور ان کے شرکاء نے خلافت کی تحریک میں عملی حصہ لیا باوجود اس امر کہ خلافت سے غیر مسلموں کو کوئی تعلق نہیں تھا مسٹر گاندھی کی اس جدوجہد میں کسی کے دل میں یہ شک و شبہ پیدا نہیں ہوا کہ گاندھی جی ہندوستان کی سیاست سے دور ہٹ گئے ہیں، اس زمانے میں لالہ لاجپت رائے نے جو ہندوؤں کے نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی لیڈر بھی تھے ایک مضمون لکھا جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسلامی ممالک میں بھی آزاد نہ ہوں۔ ہندوستان کی آزادی اور غلامی ان ممالک کی آزادی اور غلامی سے غیر منفک طور پر وابستہ ہے یہی نقطہ نظر لینن کا بھی تھا حالانکہ وہ اپنی تحریک کو مذہب کے خلاف ایک جہاد سمجھتا تھا۔ محض اپنے سیاسی اور معاشی پروگرام کو مدنظر رکھتے ہوئے لینن کا یہ خیال تھا کہ جب تک اسلامی ممالک بھی آزاد نہ ہوں یورپ کی سرمایہ داری اور ملوکیت کو شکست نہیں ہو سکتی۔

ان حقایق سے آشنا ہونے کے بعد کوئی کج اندیش شخص ہی اس نتیجے پر پہونچ سکتا ہے کہ اقبال کا جذبہ جو اسلامی دنیا کے متعلق تھا وہ اس کی حب وطن سے کوئی الگ چیز ہے۔ حریت کی ایک ہی پیکار کے یہ دو حربے تھے اور یہ دونوں حربے اقبال کی شاعری میں نمایاں اور ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

جب وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہیئے اور اس کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہیئے تو اس سے اس کی مراد فقط وہ غلط وطنیت کا جذبہ ہے جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہم وطنوں کو وطنیت کے اس جذبے کی طرف لانا چاہتا تھا جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عروج انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطہ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹیگور میں جذبہ وطنیت کی کمی ہے لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے بھی اپنی آواز بلند کی۔ ٹیگور نے دنیائے ادب میں انسانی دلوں پر جو قبضہ کیا ہے وہ وطن کے متعلق راگ گا کر نہیں کیا ہے بلکہ روح انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا ہے اور ایسے افکار اور تاثرات کی بدولت اس کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی جو ذات پات، نسل اور جغرافیائی حدود سے بلند تر ہیں۔

اقبال ہندوستان کی آزادی اور عظمت کے طالب تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے ان کی روح میں بڑی بے تابی تھی لیکن ان کو یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ آزادی محض آقاؤں کی تبدیلی نہ ہو اور ظلم کی قوتیں جوں کی توں گوروں کے ہاتھوں سے نکل کالوں کے ہاتھ میں نہ آجائیں۔ سچی آزادی کے لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر گروہ کو نہ صرف نصب العینی طور پر مساوی حقوق حاصل رہیں بلکہ آئین و قوانین اس انداز کے وضع کیے جائیں کہ اس وقت ملک میں جو جو گروہ جس حیثیت سے پس ماندہ اور مظلوم ہیں ان کی پس ماندگی اور مظلومیت کا علاج کیا جائے۔

بعض نام نہاد قوم پرست فقط انگریزوں سے سیاسی قوت چھین لینے کے درپے ہیں اور ان کے ضمیر میں وہ عدل پیدا نہیں ہوا جو تمام انسانوں کے لیے مساوی طور پر ترقی کی راہیں کھول دے۔ اقبال کے دل میں ہندوستان کے تمام مظلوم طبقوں کے لیے بڑا درد تھا اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز ان کی نگاہ میں نہیں تھی جب وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی حمایت گول میز کانفرنس میں کر رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی دیگر پس ماندہ اقوام کو بھی شریک کرتے تھے، بے سرمایہ اور محروم مزدکسانوں کی حمایت میں جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں کیش و ملت کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔

اقبال بھی وطن کی آزادی کا ایک پرجوش مجاہد تھا لیکن مغربی انداز کی وطن پرستی کو بت پرستی سمجھتا تھا جہاں دوسرے قسم کے اصنام کو توڑنے کا کام اس نے اپنے ذمے لیا وہاں یہ بڑا بت بھی اس کی ضرب و حرب سے نہیں بچ سکتا تھا۔

.....

حوالے

(۱) جناب محمد افضل الدین مجلہ عثمانیہ کے اس شمارہ کے مدیر تھے۔ جو اقبال کی وفات پر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اداریہ میں یہ نوٹ شامل ہے۔

(۲) بعد میں اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۷ء قرار دیا گیا۔

سید فخرالحسن

اقبال کی خدمات

وہ جس نے ایک بے ہمہ و باہمہ زندگی گزاری، سب سے الگ رہ کر بھی جو سب کے ساتھ رہا اور برسوں حقیقی انسانیت اور دین فطرت کا درس دیتا رہا، رزم حق و باطل کے لئے تیغ بے نیام بن کر آیا۔ انسان گم کردہ خودی کو حریم خودی سے آشنا کرایا اور رموز بے خودی کا جلوہ دکھایا، بھلا اس کے خدمات کا سچا اعتراف کس منھ اور کس زبان سے ہو سکتا ہے مگر پھر بھی آج ہم انسانیت کے اس شیدائی اور اسلام کے اس فدائی کی اہم خدمات کا ذکر کریں گے۔

اسلامی خدمات:

انسانی تاریخ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ قوموں میں ایک نہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب فساد پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو منصب انسانیت سے گرا کر ضلالت و گم راہی میں ڈال دیتی ہیں۔ چنانچہ اس سے نجات دلانے کے لئے وقتاً فوقتاً نبی آتے رہے۔ موجودہ دور کی اس عالم گیر ضلالت میں جب کہ بنی نوع انسان حق و صداقت کی روشنی سے جدا ہو کر کذب و باطل کی تاریکیوں میں پھنس گئی ہے اور انسانیت اپنے حقیقی اور اصلی مرکز سے بہک کر اوہام و خرافات کی اندھیری اور پیچ دار وادیوں میں ادھر سے ادھر بھٹک رہی ہے اسے صراط مستقیم کا کہیں نشان نہیں ملتا، مسلمان، جو سیاسی طور پر مغلوب ہو چکے تھے اور قدرت نے ان پر عذاباً اسی قسم کی آوارہ گرد، پراگندہ و دماغ قوموں کی محکومیت کی لعنت مسلط کی جس کا قدرتی طور پر اثر پڑنا چاہیئے تھا اور آخر کار پڑ کر رہا۔ وہ بھی بے دینی کے گرداب میں چکر کھانے لگے اور شک و تذبذب کے انگاروں پر لوٹنے لگے۔ اس روحانی کرب و مصیبت، درد، اور بے چینی سے نجات دلانے کے لئے یہ تو ناممکن تھا کہ پھر ایک نیا نبی پیدا ہو اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے جب کہ ان کو راہ راست پر لانے کے لئے، قرآن حکیم اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندہ سیرت، احادیث طیبہ کی شکل میں ایک زندہ رسول کا کام انجام دے رہی ہے، مگر یہاں سوال تو یہ ہے کہ جب مسلمان انہی سے کنارہ گیر ہو کر ذلت کی زندگی کا شکار ہو گئے تھے تو اب ان سے استفادہ کی شکل ہی کیا باقی رہی تھی، بجز اس کے کہ تقاضائے وقت کے لحاظ سے کوئی ایسا شخص ہو جو ان کو کتاب الہیٰ اور پیغمبرؐ کے اسوہ حسنہ کی طرف متوجہ کرے اور ایک ایسا مولوی معنوی پھر پیدا ہو جو قرآن کو قند پارسی میں نہ سہی طوطیان ہند کی گفتار ہی میں

مسلمانوں کے آگے پیش کرے اور ایک ایسا جمال افغانی وجود میں آئے جو انہیں خواب غفلت سے چونکا دے آخر یہی ہوا کہ وہ ہستی اقبال کی شخصیت میں جلوہ گر ہوئی اور اپنی آتش نفسی سے مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کے قلوب میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایک ایسا صور پھونکا کہ اگر اکثر اٹھ نہ بیٹھے تو کم از کم. چونک تو ضرور پڑے جس کا احساس اسے خود بھی ہوا اور وہ پکار اٹھا۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدائے من درائے کاروان است
حدی راتیز تر خوانم چو عرفی
کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

اقبال مسلمانوں میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس قوم کو بیدار کر کے پھر شرف انسانیت کے اعلیٰ ترین زینے پر پہنچانا اور اس کی کھوئی ہوئی عظمت اسے واپس دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ انقلاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب کا سامان پیدا کیا جائے کیونکہ یہی قانون فطرت ہے جس کو قرآن کے سادے اور بلیغ الفاظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم یعنی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مسلمانوں کی پستی کا اس وقت یہ حال تھا اور ان کی ذہنیت اس درجہ مردہ ہو چکی تھی کہ دولت، عظمت طاقت و حشمت سب کچھ لٹا دینے اور انتہائی بے بسی اور کم مائگی کی حالت پر پہنچ جانے کے باوجود بھی ان میں اتنا احساس باقی نہ رہا کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ چنانچہ اس حالت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ایسی حالت میں اقبال نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کی موجودہ حالت سے ان کو خبردار کرایا جائے، ان کو بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا جائے اور ان کے مقصد حیات اور منشائے تخلیق سے ان کو پوری طرح آگاہ کرایا جائے۔ غرض اس سلسلے میں انہوں نے ان کی تمام برائیوں کو ان کے سامنے مختلف طور پر پیش کیا اور ان کی عظمت کی جسے وہ کھو بیٹھے تھے اور ان کی حقیقت کی جسے وہ فراموش کر چکے تھے خوب خوب تشریح کی تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صرف اپنے زوال و انحطاط کے احوال سن سن کر وہ اور بھی پست ہمت ہو جائیں اور ان پر قنوطیت کا غلبہ ہو جائے بلکہ اس کی بجائے ان میں امنگ اور رجائیت پیدا ہو، امید و رجا کا یہی پیغام ہے جو موجودہ عہد کے تمام قومی شاعروں کے مقابلے میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ممتاز کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا

کہ مسلمانوں میں، ہمت کا ایک جذبہ پیدا ہوا اور دلوں میں ایک انقلابی لہر دوڑ گئی، خواہ وہ کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو۔

ایک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

مسلمان اپنی خودی کو مٹا کر غیر اقوام میں جذب ہو رہے تھے اور اغیار کے سامنے سر نیاز خم کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ یہ عمل قومی خودداری اور انسانی غیرت کی خود کشی ہے، خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھوٹنے کی اجازت کسی طرح کسی کو بھی نہیں دی جا سکتی۔

تری زندگی اسی سے تری آبرد اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

فقدان خودی کے دور میں قومی سیرت غارت ہو جاتی ہے، قلوب میں صرف نفاق ہی نفاق گھر کر لیتا ہے۔ اور ریاکاری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ خود قوم کے اکابر شیوخ میں اس عارضے کی شدت ہوتی ہے اور وہی قومی روایات و خصوصیات کو پامال کرنے لگتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کے علماء، مشائخ، حکما اور اکابر اس بدبختی میں بری طرح مبتلا تھے علما میں نہ حقیقی علم ہی باقی رہا تھا نہ عمل، مطلب کے موافق نئے نئے مسائل گڑھنا قرآن کی من مانی تاویل کرنا ان کا شیوہ بن گیا کہتے ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

مشائخ اور صوفیوں نے طریقت کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کے تحت شریعت سے کوسوں دور ہو گئے اور احکام الہیٰ اور ارشاد نبوی کو اس طرح پامال کیا کہ حقیقی روحانیت سے بالکل محروم ہو گئے نہ ان میں بایزید بسطامی کی سیرت باقی رہی اور نہ جنید بغدادی کی خصوصیت۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خون دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

ریاکاری اور عیاری کے دام میں خدا کے سیکڑوں سادہ دل بندوں کو پھنسا کر محض دولت کمانے اور گلیم فقر کی تذلیل کرنے لگے۔

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

قوم میں یوں تو نام نہاد مصلح بھی ہیں اور حکما بھی مگر ان کا جو حال ہے ملاحظہ فرمائیے۔

شاعر بھی ہیں پیدا حکماء اور علما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہی ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہی گو شرح معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

دور حاضر کی علمی و فنی ترقیوں اور تسخیر فطرت کی کرشمہ سازیوں سے مغرب میں ایک عجیب تحریک کا آغاز ہوا جس کے تحت معبود حقیقی کی پرستش کی بجائے مادیت اور مادی تنگ نظری نے ان میں وطنیت و قومیت کے نئے نئے دیوتا بنا بنا کر کھڑے کرنا شروع کر دئے۔ وہی کائنات جو انسان کے لئے تھی، انسان ہی اس کا غلام بن گیا۔ کائنات کی یہ شریف ہستی جس شریف مقصد کے لئے پیدا کی گئی تھی اس سے بیگانہ ہو گئی اور پروردگار عالم کی تسبیح و تہلیل کو چھوڑ کر امتیازات نسل و رنگ کی مالا جپنے لگی اور خدائے کائنات کی عبادت کی جگہ زبان، ملک اور نسل و رنگ کے بھجن گانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کی تقسیم در تقسیم، زبان، ملک، نسل اور رنگ کے اعتبار سے کی جانے لگی اور ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ کا دشمن بن گیا اور ان کے دلوں سے انسانیت کا احترام جاتا رہا۔ اس شیطانی تحریک کا اثر مسلمان پر بھی پڑا اور بعض ممالک اسلامیہ میں تو قومیت و وطنیت اور امتیازات نسل و رنگ کو معبود حقیقی اور مقصود اصلی کا درجہ بھی ملنے لگا۔ اقبال نے اس کے خلاف ایک زبردست آواز بلند کی اور بتایا کہ کس طرح نہ صرف یہ صحیح انسانیت کے اصول کے منافی ہے بلکہ اسلامی عقائد کے بھی بالکل خلاف ہے، انسانیت کی اس سے بیخ کنی ہوتی ہے، اسلامیت کی اس سے جڑ کٹتی ہے۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کم زور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مغربی اقوام ہوں خواہ مشرقی آج کل انہوں نے قومیت کی ساری بنیاد وطن پر رکھی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ خود غرضی اور تفرقہ انگیزی، جنگ و جدال در ہر قسم کے استحصال نے بنی نوع انسان کی مٹی پلید کر ڈالی۔ اقبال نے بتلایا کہ افراد قوم کی صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ انسان جغرافی حدود سے بالاتر ہو جائے اور صاف طور پر یہ واضح کر دیا کہ ملت اسلامیہ کی بنیاد وطن پر رکھنا بالکل ناجائز ہے۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انساں را قبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است
تلخی پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت کم شود اقوام ماند

ایک اور جگہ اپنے اس مسلک کی تشریح ایک اسلامی واقعہ سے کرتے ہیں کہ ملک خدا کی ملکیت ہے جس پر اس کے تمام بندوں کا برابر برابر حق ہے۔

طارق جو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
دوریم از سواد وطن باز چون رسیم
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است

ر تورانی و ایرانی اور ہندی و افغانی کی تعریفیں باقی ہیں۔

ترک سبب زردئے شریعت کجا رو است
"ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے است"

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ وطنی فرق اور نسلی امتیاز سے قوموں میں تباہی پھیل رہی ہے مگر اور ہندی و افغانی کی تعریفیں باقی ہیں۔

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

قوم جب تنزل اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کے قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں۔ یقین جاتا رہتا ہے اور قوم شک کی ٹھوکریں کھانے لگتی ہے۔ لوگوں میں مستی کردار مطلق باقی نہیں رہتی اور مجاہدانہ اوصاف یک قلم مفقود ہو جاتے ہیں وہ اپنی ناکامی اور نامرادی کی بے جا تاویلات کرنے اور اس کو تقدیر الہیٰ کے سر تھوپنے کے عادی ہو جاتے ہیں قناعت بے جا کے تحت اچھی شے کے حصول کی پروا نہیں کرتے اور بری ہی شئے کو بہتر شمار کرنے لگتے ہیں۔

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

چنانچہ انہیں حالات کے پیش نظر اقبال نے یقین و عمل کی ہر جگہ مختلف پیرائے میں تعلیم دی اور ان کے اسرار سے مسلمانوں کو آگاہ کرانے کی کوشش کی۔

یقین محکم ، عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یقین مثل خلیل آتش نشینی

یقیں اللہ مستی خود گزینی

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار

غلامی سے بتر ہے بے یقینی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے کہ غلام قوم خود بھی ذلیل ہو جاتی ہے اور اپنے ساتھ تمام خصوصیتوں اور روایتوں کو بھی ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ اپنے پیغمبر دین کو بھی رسوا کر رہے تھے۔ اور ان کے خصوصیات کو عملاً بے معنی سمجھنے لگے تھے اقبال نے اسلام کی بلندی و برتری کی ایسی تشریح کی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی حیران ہو گئے کہ واقعی ہمارا اسلام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسئلہ خلافت انسان کی ایک عجیب و غریب تعبیر کی اور کائنات کے آقائے علی الاطلاق ہونے کی خوب خوب تشریح کی مختلف پیرائے میں اس کا جابجا ذکر کیا اور بتلایا کہ ساری کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ زمین و آسمان، چاند، سورج، حور و ملائک سب کے سب انسان کے لئے ہیں اور انسان ان سب کی شمولیت میں خدا کے لئے اور پھر خدا انسان کے لئے ہے۔ اس نکتہ کی تشریح نہایت حکیمانہ اور لطیف و بلیغ پیرایے میں یوں کرتے ہیں۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آورائے ہمت مردانہ

پھر اسی خیال کو اردو میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدہ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

ایک سچا مسلمان جب کہ انسان کامل ہے **انی جاعل فی الارض خلیفہ** کی سچی تعبیر ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ سارا عالم اس کی میراث نہ بن جائے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اقبال عبد و معبود کے تعلق کو قانونی رسم کی بجائے عاشق و معشوق کا تعلق کہتے ہیں اور اس طرح انسانی زندگی کو کیف بخش اور نشاط انگیز بنا دینا چاہتے ہیں اور اس میں ایک سوز و

ساز پیدا کر دیتے ہیں۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم

بہ برگ لالہ رنگ آمیزی عشق
بجان ما بلا انگیزی عشق
اگر ایں خاکداں را واشگافی
درونش بنگری خونریزی عشق
عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

جمال عشق و مستی نے نوازی
جلال عشق و مستی بے نیازی
کمال عشق و مستی ظرف حیدر
زوال عشق و مستی حرف رازی

داعی اسلام کے ساتھ مسلمانوں کے باطنی لگاؤ اور دلی عقیدت کی چنگاریاں کو اقبال نے خوب خوب چمکایا، اس باب میں ان کا کلام نہ صرف اردو بلکہ شاید دوسری اسلامی زبانوں کے ذخیرے سے بھی دعوی برتری کر سکتا ہے

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا ؟ لوح و قلم تیرے ہیں

یہاں تک تو ہم نے دیکھا کہ اقبال نے کس طرح اسلامی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا ان کے دلوں میں نئے سرے سے اس کی عظمت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ کام صرف یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ابھی تو صرف نبض دیکھی تھی اور مرض کی تشخیص ہوئی تھی مریض کو جو روز بروز نحیف و مضمحل ہوتا جارہا تھا یہ بتایا گیا کہ وہ کس مرض مہلک کا شکار ہے۔ لہذا اب ضرورت تھی کہ معالجے کی طرف توجہ کی جائے چنانچہ اس کے لئے جو نسخہ کارگر اقبال کو نظر آیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ انسان کی حقیقت بہ حیثیت فرد کیا ہے اور ایک فرد کو انسان کامل بننے کے لئے جو دراصل مرد مسلمان کا درجہ ہے، کون سی چیز سب سے اہم ہے چنانچہ اس عجیب و غریب انفرادیت کے لئے خودی کی صفت کو ضروری قرار دیتے ہیں جس کے ذریعے انسان تخلقوا باخلاق اللہ کا سچا مظہر بن کر خالق کائنات کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اجتماعی حیثیت اختیار کرنے کے لئے خودی کے درجے سے گزر کر بے خودی کی منزل میں قدم رکھنا ضروری ہے یعنی جب تمام افراد میں اختلاط پیدا ہوجاتا ہے اور فرد ملت میں گم ہوجاتا ہے، اور یہی ملت دراصل ملت اسلامیہ ہے جس میں حریت، مساوات اور اخوت بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں اور جس کی زمانی یا مکانی حد بندی نہیں کی جاسکتی غرض اقبال نے فلسفہ خودی اور رموز بے خودی کو ملت اسلامیہ کی حیات و بقا کا واحد علاج بتایا ہے۔

خودی کو یہ اصل نظام عالم قرار دیتے ہیں جس پر افراد کی زندگی کے تسلسل کا انحصار ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہرچہ می بینی ز آثار خودی است
خویشتن را چون خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد

چوں خودی آرد بہم نیردے زیست
می کشاید قلزمے از جوئے زیست

عشق و محبت سے خودی کو تقویت پہنچتی ہے اور گدائی سے یہ کم زور ہو جاتی ہے۔ پس خودی کے استحکام کے لئے لازمی ہے کہ عشق و محبت یعنی جذبہ۔ عمل کو بڑھایا جائے، اور ہر قسم کی گدائی یعنی بے عملی سے احتراز کیا جائے۔

نقطہ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر سو زندہ تر تابندہ تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخل۔ سینائے خودی

خودی کی تربیت کے لئے تین مراحل طے کرنا پڑتے ہیں اول اطاعت، دوم ضبط نفس، سوم نیابت الہیٰ اور یہی نیابت انسانی زندگی کا درجہ۔ کمال ہے جب کہ خودی مکمل ہو جاتی ہے اور انسان بہ حیثیت خلیفتہ اللہ دنیا پر حکومت کرتا ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است
ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جزو کل آگہ بود
در جہاں قائم بامر اللہ بود

یہاں تک خودی کا درجہ ہے اس کے بعد بے خودی کا درجہ آتا ہے۔ جب کہ تمام افراد ایک ہی رشتہ ملت میں منسلک ہو جاتے ہیں اور فرد ملت کا ایک ایسا ربط باہمی قائم ہو جاتا ہے کہ فرد جماعت میں گم اور جماعت فرد میں گم ہو جاتی ہے وحدت کثرت میں جذب اور کثرت

وحدت میں پہناں ہو جاتی ہے۔

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر اوراکمال ازملت است
ناتوانی باجماعت یار باش
رونق ہنگامہ احرار باش
حرزجاں کن گفتہ خیر البشر
ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینہ یک دیگراند
سلک گوہر کہکشاں و اختراند
فرد می گیرد زملت احترام
ملت از افرادمی یابد نظام
فردتا اندر جماعت گم شود
قطرہ وسعت طلب ، قلزم شود
پیکرش از قوم و ہم جانش زقوم
ظاہرش از قوم و پہنانش زقوم
وحدت او مستقیم از کثرت است
کثرت اندر وحدت او وحدت است

اب اس ملت کو ملت اسلامیہ میں تبدیل کرنے کے لئے جن اساسی ارکان کی ضرورت ہے وہ توحید خداوندی اور رسالت محمدیؐ ہیں جن کے بغیر ملت اسلامیہ کی تاسیس و تشکیل ناممکن ہے۔

ملت بیضا تن و جاں لا الہ
ساز مارا پردہ گرداں لا الہ
لا الہ سرمایہ اسرار ما

رشتہ اش شیرازہ افکار ما
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

رسالت کی تعبیر فرماتے ہیں۔

حق تعالی پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ماجاں دمید
حرف بے صوت دریں عالم بدیم
از رسالت مصرعہ موزوں شدیم
از رسالت درجہاں تکوین ما
از رسالت وین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار مایک است
جزء ما از جزء ما لاینفک است
ما ز حکم نسبت او ملتیم
اہل عالم را پیام رحمتیم
فرد از حق ملت ازوے زندہ است
از شعاع مہر او تابندہ است

بنی نوع انسان کو اپنی جماعت یا ملت میں منزل انسانیت پر پہنچنے اور عزت و احترام کی زندگی بسر کرنے کے لئے لازمی ہے کہ اس میں حریت، مساوات اور اخوت کے زریں اوصاف پائے جائیں۔ چنانچہ ان کی تاسیس و تشکیل رسالت محمدی کے ذریعے عمل میں آئی۔ دنیا میں جس وقت خواجگی اور بندگی کا دور دورہ تھا ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی میں ذلت و حقارت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مرتبت انسانیت کے سیکڑوں درجے مقرر تھے اور بنی آدم کے درمیان بیگانگی و مغائرت کی سیکڑوں خلیجیں حائل تھیں کہ صحرائے عرب میں بحیرہ احمر کے ساحل پر ایک رسول آخر الزماںؐ آیا اور اپنی رسالت کے ساتھ حریت اور مساوات اور اخوت کا

پیغام لایا اور غلامی و بادشاہی کی زنجیر آہنی کو اپنی آسمانی تیغ کی ایک ہی ضرب سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محتاج و غنی کے امتیازات جاتے رہے اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہوگئے۔ یہ تھا رسالت محمدیہ کا اعجاز جو ملت اسلامیہ کا راز ہے۔

کسی ملت کے نظام کے لئے آئین و قوانین ہونا چاہئیں چنانچہ اس ملت اسلامیہ کا آئین مسلم اور قانون محکم قرآن مجید قرار پایا۔

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیر گردوں سر تمکین تو چیست
آن کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت اولا یزال است و قدیم
نسخہ۔ اسرار تکوین حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف اورا ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندہ۔ تاویل نے
گر تومی خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستین

اقبال نے نہایت صداقت و خلوص کے ساتھ مسلمانوں کو بتادیا اور جتلادیا کہ ان کی زیست و بقا کا دار و مدار صرف قرآن و رسالت ہے۔

انسانی خدمات:۔

اسلامی خدمات کے سلسلے میں ہم نے ابھی دیکھا کہ اقبال کی ساری تعلیم صحیح انسانیت پر مبنی ہے جو لوگ اسلام اور اسلامی تعلیم کو محدود کر دیتے اور عام انسانی فلاح و بقا کو پیش نظر نہیں رکھتے وہ در حقیقت اسلام کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے جس کا مقصد بنی آدم کو انسانیت کے اعلیٰ ترین مراتب اور کامیابی و فلاح کے بلند ترین مدارج پر پہنچانا ہے اور یہ اس بات کی کوشش کرنا ہے کہ انسان اس رفیع ترین مرتبے سے جو اس کے شایان شان ہے، گر کر خدا کی دیگر مخلوق کے سامنے ذلیل نہ ہونے پائے۔

اقبال کی شاعری محض مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے اور ان کی خدمات نہ صرف مسلمانوں کے واسطے ہیں بلکہ تمام انسانوں کے واسطے۔ ان کے فلسفہ خودی سے نہ صرف ایک مسلمان بہرہ ور ہو سکتا ہے بلکہ دیگر انسان بھی مساوی طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زور خودی سے پربت
پربت ضعف خودی سے رائی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ تو روسیاہی

ان کی تعلیم محبت میں نہ صرف مسلمانوں کی فلاح و نجات ہے بلکہ عام انسانوں کی بھی۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ایک دوسرے انسان کی بندگی کرے وہ جوہر شرافت کا احترام کرتے اور اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں وہ انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے، کبھی بھی حیوان کے درجے پر دیکھنا نہیں چاہتے۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد وجم کرد
یعنی اللہ خوئے غلامی زسگاں خوار ترست
من ندیدم کے سگے پیش سگے سرخم کرد

انسان کو باہمی پیار اور محبت کا درس کس لطیف پیرایے میں دیتے ہیں۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

تمدنی و عمرانی خدمات:

اقبال کا شمار عہد حاضر کے ان مفکرین میں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے تہذیب نو کی اور تمدن جدید کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے چنانچہ ان کی نگاہیں موجودہ تمدن کی تہہ تک پہنچ گئیں اور انہوں نے اس کو بے نقاب کر کے تمام نقائص پر روشنی ڈالی اور آنے والے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

ہر تہذیب و تمدن میں عموماً تین بڑے عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ ایک معیشت، دوسرے معاشرت۔ تیسرے سیاست چنانچہ موجودہ تہذیب و تمدن کے انہیں تینوں عناصر کا مطالعہ علی الترتیب، ہم اقبال کے اشعار کی روشنی میں کریں گے۔

معیشت:۔

موجودہ نظام معیشت کی سب سے بڑی خصوصیت سرمایہ داری کا عروج اور اصل دارانہ طریق پیدائش کا کمال ہے جس کے تحت دولت ایک کثیر مقدار میں پیدا ہو رہی ہے مگر اس دولت کو پیدا کرنے والے دو اہم عوامل یعنی آجر اور مزدور کو جو ثمرہ ملنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ایک مالا مال ہو جاتا ہے اور دوسرا خستہ حال، بے چارہ مزدور روٹیوں کو محتاج اور آجروں کے در کا بھکاری بن گیا ہے۔ دولت کی بے جا تقسیم نے سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوروں کے حقوق تلف کر ڈالے اور وہ اپنی جائز اجرت سے بھی محروم کر دیئے گئے۔

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

خواجہ از خون رگ مزدور ساز د لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

یہ ہے موجودہ نظام معیشت کا خلاصہ جس سے تنگ آکر کارل مارکس، جرمنی کے مشہور اسرائیلی ماہر معاشیات نے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور ایک نیا نظام معیشت پیش کیا۔ کارل مارکس کی آواز سنیئے:۔

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خم دار کی نمائش مزیر و کج دار کی نمائش

موجود و نظام معیشت میں ساری قوت سرمایہ داروں کو اور ساری اہمیت اصل و سرمایے کو حاصل ہے جو تجارتی کاروبار اور سود کی پیداوار ہے یہ وہی سود ہے جس کو ارسطو نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے کہ زر چونکہ بچے نہیں دیتا اس کو قطعاً ناجائز قرار دے دیا۔ یہ وہی سود ہے جس کے متعلق کارل مارکس کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک قسم کی ڈکیتی ہے جس کے ذریعہ سرمایہ دار غیر معمولی طاقت حاصل کر لیتا ہے اور مزدور اس کی چیرہ دستیوں کا شکار بن جاتا ہے۔ یہ وہی سود ہے جس کو اسلام اور بعض دیگر مذاہب نے بھی حرام قرار دیا ہے۔ مگر معاشی تاویلات نے اسے جائز قرار دے دیا۔ حالانکہ یہ تجارت کی فریب دہی ہے جس کے پردے میں جوا کھیلا جارہا ہے اور سود کے پیدا آور ہونے کا ایک بہانہ ہے جس کے ذریعے لین دار کا خون چوسا جارہا ہے، اس راز کو اقبال نے طرح طرح سے فاش کیا ہے۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

تجارتی تعلقات کی ترقی نے مختلف اشیاء کا مختلف ممالک کے مابین مبادلہ، رقوم کی ادائیگی، اصل و سرمایہ کی فراہمی اور نظام زر کی ترقی نے بڑے بڑے بنک قائم کر رکھے ہیں جن کی عالی شان عمارتوں سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات

دنیا کی ہر زرعی ملک میں کاشت کار اور کسان طبقہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس ملک کی دولت بڑی حد تک اسی کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن یہ کس قدر ناانصافی ہے کہ اس سے مستفید دوسرا طبقہ ہوتا ہے اور کسانوں کا خون چوسا جاتا ہے۔ ہندوستان کے زراعت پیشہ طبقے کا یہی حال ہے۔ اس کی پیداوار کے مالک حاکم، زمیندار اور ساہوکار ہوتے ہیں اور یہ بے چارہ ان کا دست نگر اور مرہون منت ہو کر انتہائی غربت و افلاس کی زندگی بسر کرتا ہے۔

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے

افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

قدیم زمانے میں جو جنگیں ہوا کرتی تھیں وہ بہت کچھ جہاں بانی اور ملک گیری کے جذبے کے تحت مگر آج کل کی جنگوں کا مقصد محض معاشی استحکام و اقتدار حاصل کرنا ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے خوں ریزی و غارت گری کو اس درجہ عام کر دیا ہے انسانی خون پانی کی طرح بہایا جارہا ہے، حبش، ہسپانیہ اور چین کی جنگیں، ہمارے سامنے ہیں۔

غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش ہر گرگ کو ہے برہ معصوم کی تلاش

معاشرت:۔ تہذیب جدید کے معاشی پہلو کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم معاشرت کا اخلاقی و معاشری معیار بہت کچھ بدل گیا۔ اور ان کی جگہ نت نئے اصول و معیار تراشے جارہے ہیں۔ اسلاف کے عادات و اطوار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جو کام پہلے معیوب سمجھا جاتا تھا اب مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ غرض قمار بازی، مے خواری، فیشن پرستی، نسوانی آزادی و بے پردگی جیسی ہر شے، موجودہ تہذیب کے لوازم میں داخل ہے۔ تہذیب کے فرزندوں کے خیال میں جب تک یہ ساری باتیں کسی معاشرت یا قوم میں نہ ہوں وہ مہذب نہیں کہی جاسکتی۔

جہاں قمار نہیں زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مئے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب و عمیق
طریقہ اب وجد سے نہیں ہے بے زاری
نظر دران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

تعلیم نسواں کی عمومیت اور عورتوں کو مردوں کے ہم پلہ کر دینے کی ہوس نے عورتوں کو کہیں کا بھی نہ رکھا عورتوں نے تعلیم پائی اپنی جہالت کو دور کیا، اچھا کیا، مگر افسوس اس کے ساتھ ہی نسوانیت کو بھی بھلا بیٹھیں ایسی تعلیم جو عورت کو عورت باقی نہ رکھے کہاں تک درست ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہی نازن کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

مغرب والوں نے پردہ کو اتنا ذلیل سمجھا کہ یک قلم اسے اتار پھینکا۔ عورتیں بے پردہ ہو گئیں، خلوت سے جلوت میں آئیں، آنکھوں سے نسوانی حجاب اٹھ گیا۔ نگاہیں روشن ہو گئیں مگر افکار و خیالات روشن نہ ہو سکے۔ معاشرت میں بد اخلاقی رچ گئی۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے

روشن ہے نگہ آئینہ دل ہے مکدر
ہوجاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

مغربی معاشرت کی خصوصیت و کمالات کا ایک اور نتیجہ ملاحظہ فرمائیے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
ہندو یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
مرد بے کار زن تہی آغوش

آخر معاشرت میں یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوئیں؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ مرد یا عورت؟ یہ کس کی خوبی عقل کا نتیجہ ہے؟ جواب ملتا ہے کہ اسی مرد فرنگ کے یہ سب کرامات ہیں۔

قصور زن کا نہیں اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

تہذیب و تمدن کی ترقی و تغیر کے ساتھ ادبیات و فنون لطیفہ میں بھی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ فنون لطیفہ میں مصوری اور مجسمہ تراشی کو قدیم زمانے سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ موجودہ زمانے کی معاشرت میں سینما نے خاص درجہ حاصل کر لیا ہے۔

وہ صنعت نہ تھی شیوہ کافری تھا
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے

ہندوستانی شاعر، ہندوستانی ادیب اور مصور کا یہ حال ہے کہ مغربی تہذیب کا پجاری اور فرنگی ہنر کا بھکاری ہے۔ وہی عورت پرستی و شہوت ناکی اس پر بھی مستولی ہے۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ، تاریک میں قوموں کے مزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے

آہ ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

غرض مغربی تہذیب نے موجودہ معاشرت کا جو حال کر دیا ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ

بے کاری و عریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

سیاست:۔

اس میں شک نہیں کہ انسان نے علم و فن میں گوناگوں ترقیاں کیں اور نئے نئے کمالات پیدا کئے سیاست اور طرز حکومت نے نئی نئی شکلیں اختیار کر لی ہیں جو بظاہر تو ترقی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر بہ نظر غور دیکھا جائے اور ان کے عملی نتائج کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب مستبد ملوکیت سے کسی طرح کم نہیں ۔ قرآن حکیم میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے ۔ **ان الملکو اذا دخلوا قریتہ افدوھا وجعلوآ اعزۃ اھلھا اذلۃ** (بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے اور وہاں کے سرداروں کو بے عزت کر دیتے ہیں) اور اقبال نے اس کی توضیح یوں کی ہے ۔

آبتادوں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے ، یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داری کی ہے جنگ زر گری

غرض شہنشاہیت ، جمہوریت ، اشتراکیت اور فاشیت کے پردے میں مردم کشی و غارت گری اس طرح جائز ہو گئی اور اس بت نے انسان کی وہ گت بنا رکھی ہے کہ بنی آدم کا اس خاک دان ارضی پر چین اور اطمینان کی زندگی بسر کرنا ناممکن ہو گیا ہے ۔ ارباب سیاست جن کو حریت اور انسانیت کا نگہبان بنایا گیا تھا وہی اسے اس طرح پامال کر رہے ہیں اور لاکھوں معصوم بندگان خدا کو اس بے رحمی سے ہلاک کر رہے ہیں کہ الامان والحفیظ ، شیطان نے تو اپنی ابلیسیانہ حرکت سے ایک ہی انسان کو قتل کرایا تھا مگر آج ارباب سیاست اپنی اس خصلت سے لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں ۔ خود شیطان بھی کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے

اور پکار اٹھتا ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

ہر قوم کا سیاسی مقصد یہ بن گیا ہے کہ دنیا کی ساری طاقتوں کی تنہا مالک ہو جائے چاہے اس میں کتنی بھی سفاکی اور خوں ریزی سے کام لینا پڑے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ظلم و استبداد کی تلواریں سیاسی نیام سے بے دھڑک نکلتی اور کم زور اقوام کی گردن پر چلتی جاتی ہے۔ جاپان نے نہ صرف منچوریا کو ہڑپ کر لیا بلکہ چین پر بھی اپنے خونی پنجے مار رہا ہے۔ اطالیہ نے کم زور حبش کو ایک آن واحد ہضم کر لیا۔ فلسطین ایک عجیب بدامنی کا شکار ہے۔ اسپین میں ایک نئی طاقت برپا ہے۔ غرض ایک طاقت دوسری طاقت کی حریف بنی ہوئی ہے اور لطف تو یہ ہے کہ ہر طاقت صرف اپنے لئے ظلم و سفاکی کی روا تصور کرتی ہے اور دوسروں کو ملامت کرتی اور طعنے دیتی ہے۔ حالاں کہ غرض و غایت سبھوں کی ایک ہی ہوتی ہے چنانچہ مسولینی اپنے مشرقی حریفوں سے سوال کرتا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
مرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کم زور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راج دھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آل سبزر چوب نے کی آبیاری میں رہے
تم نے تو دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑے بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقان تم نے لوٹے تخت و تاج
پردہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

انگلستان کے اہل قلم مذہبی پیشوا نے لکھا ہے کہ "کسی عقلی اور اخلاقی معیار سے بھی جانچا جائے تو دنیا میں فرڈرک اعظم اور نپولین سے بڑھ کر کوئی بدمعاش نہیں گزرا اس لئے کہ ان دونوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ جنگ کئے جاؤ چاہے انسانوں کا کتنا ہی خون بہہ جائے۔" سکندر اور چنگیز پر بھی ان کے مظالم و استبداد

کے پیش نظر لعنتیں بھیجی جاتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ان لعنتوں میں صرف ان بے چاروں ہی کو کیوں شریک کیا جاتا ہے یہاں تو ایسے کتنے ظالم ہیں جنہوں نے موجودہ زمانے میں سفاکی اور خوں ریزی کو اپنا پیشہ بنالیا ہے ۔ سکندر کی قزاقی اور سفاکی صرف خشکیوں تک محدود تھی ۔ موجودہ زمانے کے سکندر کی قزاقی اور سفاکی خشکی سے متجاوز ہو کر سمندروں پر چھا گئی چنانچہ قدیم سکندر جدید سکندر کی بڑھتی ہوئی سفاکی کو دیکھ کر اس پر لعنت بھیجا ہے ۔

صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دنیا کی پہنائی

اس کا جواب موجودہ سکندر جس کی حیثیت ایک بحری قزاق کی ہے اس طرح دیتا اور اپنا راز فاش کرتا ہے ۔

سکندر ! حیف تو اس کو جواں مردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی
تیرا پیشہ ہے سفاکی میرا پیشہ ہے سفاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں ، تو میدانی میں دریائی

اسی خوں ریزی اور بدامنی کو روکنے کی خاطر جمعیت اقوام قایم کی گئی اور لوگوں نے یہ سمجھا کہ اب دنیا کے ہر گوشے میں امن ہی امن کا دور دورہ ہوگا ۔ لیکن اقبال فرنگ و سیاست افرنگ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ۔

برفتند تا روش رزم دریں بزم کہن
درد مندان جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

نتیجہ بھی اس انجمن کا ایسا ہی ہوا اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ ارباب سیاست کی عیاریوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں چل سکتی ۔ بے چاری امن کی یہ دیوی کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے ۔ آج ختم ہوئی ۔ کل ختم ہوئی ۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

بہر حال موجودہ تہذیب و تمدن کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کچھ دنوں اور یوں ہی رہے تو پھر اس کا کیا حال ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بجز اس کے کہ سائنس کی ترقی، سیاست کی پیچیدگی اور اقوام عالم کی خود غرضی، انسانیت اور بھلمنساہٹ سے بے توجہی اپنا گلا گھونٹ لے گی۔ اور مغرب کی یہ رنگینیاں کچھ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوں گی۔

شفق نہیں مغربی افق یہ جوئے خوں ہے یہ جوں خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

لہذا تہذیب و تمدن کے علم برداروں کو سمجھ لینا چاہیئے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

ادبی خدمات

اقبال کی ادبی خدمات سے متعلق تو بہت کچھ لکھا چکا ہے اور لکھا جائے گا مگر یہاں اس کا ذکر ایک تو یوں بھی ضروری ہے کہ یہ مضمون ادھورا نہ رہ جائے دوسرے اس لئے کہ اس ضمن میں بعض ایسی باتوں کا خاص طور پر اظہار مقصود ہے جن پر عموماً بہت کم توجہ کی گئی ہے یوں تو ادبی خدمات کے سلسلے میں اقبال نے پیام مشرق "مثنوی اسرار و رموز" جاوید نامہ جیسی گراں مایہ کتابیں لکھ کر فارسی جیسے وسیع ادب کو بھی اپنا رہن منت بنائے بغیر نہ چھوڑا مگر اردو ادب کو انہوں نے اپنی حکیمانہ، فلسفیانہ اور فطری شاعری کا جو ایک بے بہا خزانہ عطا کیا ہے اس کے بار احسان سے وہ کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے جدید اردو شاعری میں ایک ایسا رنگ بھر دیا کہ نہ صرف جدید شاعری کے پرستاروں کو یہ رنگ بھلا معلوم ہوا بلکہ قدیم دبستان سے تعلق رکھنے والوں کے منہ سے بھی بے ساختہ واہ نکل گئی۔

اقبال نے اپنی شاعری کے لئے آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل موضوع اور عنوان کا انتخاب کیا تاکہ متوسط اور معمولی فہم والے بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور اعلیٰ ذہانت و فہم رکھنے والے بھی اس سے لطف حاصل کر سکیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ بچوں کے لئے بھی متعدد نظمیں لکھیں۔ اس کے علاوہ ایک طرہ امتیاز جو اقبال کو حاصل ہے وہ یہ کہ انہوں نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور نہ صرف کامیاب ہی رہے بلکہ اس میں کمال بھی پیدا کیا۔ غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں جدید رنگ کا شاعر بھی قدیم طرز اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر اقبال نے نہ صرف قدیم طرز میں عمدہ سے عمدہ غزلیں لکھیں،

بلکہ اپنی غزلوں میں ایک نیا رنگ ایسا پیدا کیا کہ وہ اپنے کمال حسن اور ترنم و سوز میں کسی طرح بھی قدیم طرز کی غزلوں سے کم نہیں۔ پھر خوبی یہ کہ کسی غزل کو بھی شروع سے آخر تک پڑھ جایئے ہر شعر میں ایک نئی خوبی، ایک نیا حسن ایک نیا تخیل اور سوز و ساز ظاہر ہوتا ہے۔ یہ امتیاز نہ صرف غزلوں میں پایا جاتا ہے بلکہ تقریباً ان تمام اصناف شاعری میں مشکل سے کوئی بھی شعر بھرتی کا معلوم ہوتا ہے اور غالباً ان کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی بناء پر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اقبال دنیا کے ان چند شاعروں میں ہیں جن کے کلام میں شاذ و نادر کوئی شعر یا مصرع بھرتی کا ملتا ہے۔

اقبال کی قدیم طرز کی غزلوں سے بہترین اشعار کے سلسلے میں یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے

تڑپ کے شان کریمی نے لے لیا بوسہ کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گاروں میں

اسی طرح جدید رنگ کی غزلوں میں سے ہم یہ اشعار پیش کر سکتے ہیں۔

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ تیرے پیمانہ میں ہے ماہ تمام اے ساقی

کوہ شگاف تری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

کہہ گئیں راز محبت پردہ داری ہائے عشق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبط فغاں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
تھی وہ اک درماندہ رہ رو کی صدائے درد ناک
جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں
عرصہ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داور محشر کو اپنا راز داں سمجھا تھا میں

اردو زبان میں جو دو معرکتہ الآرا مسدس ملتے ہیں اور زندہ جاوید سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک تو حالی کا مسدس مد و جزر اسلام ہے۔ دوسرا اقبال کا شکوہ و جواب شکوہ ہے۔ حالی میں قنوطیت غالب نظر آتی ہے اور اقبال میں رجائیت اس کے علاوہ اقبال نے اردو شاعری کے خزانے میں ایک اور گوہر نایاب کا جو اضافہ کیا وہ ان کے دو مرثیے ہیں۔ یوں تو اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے مرثیے موجود ہیں مگر ان میں نہ تو کوئی ایسا مرثیہ ملتا ہے جس میں فلسفہ، موت و حیات پر علمی بحث کی گئی ہو جیسا کہ یورپی زبانوں کے بعض مرثیوں میں کی گئی ہے دوسرے یہ کہ ایسا مرثیہ بھی نہیں ملتا جس کا موضوع فرد واحد کے بجائے انسان کی ایک مخصوص جمعیت ہو۔ انگریزی زبان میں ایسے مرثیے ہیں جن میں مسئلہ موت و حیات

پر حکیمانہ اور فلسفیانہ بحث کی گئی ہے مثلاً ٹینی سن کا "ان مے موریم" جس کا موضوع فرد واحد یعنی خود اس کا دوست ہنری ہیلم ہے اور جس میں موت و حیات کے فلسفے پر نہایت ہی پر مغز اور حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ دوسرے گرے کا وہ مشہور مرثیہ ہے جس کا ترجمہ گور غریباں کے نام سے کیا گیا ہے اور جس کا موضوع ایک خاص جماعت انسانی ہے۔

اقبال نے بجنسہ ایسے دو معرکتہ الآرا مرثیے لکھے ایک تو "والدہ مرحومہ کی یاد" ہے جس کا موضوع خود ان کی والدہ مرحوم ہیں اور اس میں ٹینی سن کے "ان مے موریم" کی طرح زندگی اور موت کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا "گورستان شاہی" جس کا موضوع گرے کے گور غریباں کی طرح جماعت انسانی ہے مگر دونوں میں یہ فرق یہ ہے کہ اول الذکر شاہان قطب شاہی سے متعلق ہے اور ثانی الذکر انگلستان کے ایک دیہات کی غریب جماعتوں سے۔

اس کے علاوہ انہوں نے فطری مناظر اور مختلف عنوانات پر بھی ایک کثیر تعداد میں نظمیں لکھیں نیز کائنات اور موجودہ تہذیب و تمدن کے مختلف اور گوناگوں مسائل سے متعلق جابجا اپنی شاعری میں نہایت ہی عالمانہ، دل فریب اور موثر طریقے پر بحث کی۔

اقبال نے ادبی خدمات کے سلسلے میں جو خدمت اردو زبان کی کی، اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری کو زندہ جاوید بنانے میں غالب، میر، انیس و دبیر، اکبر و نظیر اور حالی کے بعد جس شاعر نے کام کیا وہ اقبال ہیں انہوں نے اردو شاعری میں ایک انقلاب عظیم برپا کیا اور اس کو بہت مالا مال کیا۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

اس کام کو بہ طور احسن انجام دیا اور گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مشاطگی کا پورا پورا کمال دکھلا دیا۔

Then why should the birds brag.
This insulting remark hurt his vanity and the bird thus began:
"No doubt thou too canst fly,
But thy range is limited to the tops of human habita tions.
Thou art unaware of the aspiration of birds.
Thou livest down on the earth, whereas they scale the heavens.
Thou art a domestic fowl and thou searches for food in the dust,
Whereas they, in search of grain, peck at the stars.

Shakespeare.

The twilight of morning finds a mirror in the majestic flow of a river,
The melody of evening is reflected in its glossy quiet.
A rose-petal bears a mirror to the beautiful goddess of Spring.
For wine, the bridal bower of glass is a mirror.
Beautyis the mirror for truth, and the heart is the mirror for beauty.
For human hearts the beauty of thy songs is a mirror.
Life owes its perfection to thy heaven-scaling imagina tion.
Was thy omniscient genius all that nature could bring forth?
When the searching eyes searched for thee,
They found the sun lost in its own radiance
Thou ledst a very obscure life, yet thine eyes saw the world in all its nakedness.
Nature is so much given to the preservation of its mysteries,
That it will never create such a confederate again.

upon the earth.
Now I am in a desert, now in a garden.
Cities, ruins, jungels and oceans are all my domains.
If I choose to rest in some emerald valley, the mountain green serves me as a bed of velvet
God has endowed me with the faculty of showering pearls.
I urge the camel of the goddess of nature to go forward.
I mitigate the miseries of the depressed peasants, and impart a loveliness to the youths in gardens.
Sometimes like locks I spread myself on the face of the globe.
The comb of the violent blasts of wind restores me to order.
From a distance I tantalize the expectant eyes,
While passing calmly over some green valley.
Out on my round of pleasure,
When I chance to sail over some lake
I present the ear-rings of Vortex to its waters.
I am the hope of the rising green, daughter of the waters and the morning sun.
To the mountain stream I granted the undulation of the sea and standing beside the green I ordered it to rise.
These nightly huts: cottages of the peasants by the mountain side are an outcome of my munificence.

A Dialogue

A domestic fowl said to a bird
Thou hast wings but are they denied to me?
If thou canst fly, I too can.
If thou art free, I too am not in bondage.
Flight is characteristic of all winged creatures,

Islamic Anthem

Ours is china, Arabia and India too.
We are Muslims and the whole world is our mother-land.
The dauntless flame of monotheism burns in our hearts,
It is not easy to destroy us.
We are the custodians of the very first temple of God on the globe,
Which in its turn shields us from all calamities.
We are brought up under the shadow of swords,
Our natioanl emblem bears a sword of crescent.
Our Azan has resounded in the villages of the west.
None could resist our ever-advancing torrent.

O heavens, you have tried us many a time,
And you know that we cannot be overpowered by any falsehood.
When we had our nests in your branches.
You too recognize us, O waves of the tigris,
Your waves still sing song of our achievements.
O precincts of Kaaba, we have sacrificed our lives on the altar of thy reverence,
Our blood still runs through thy veins.
Mir-e-Hijaz is the leader of our caravan,
His is the name which is, for us, a source of eternal comfort.
Iqbal's anthem is, as it were, a clarion call
Lo !our caravan starts again.

The Mountainside Cloud

My sky bower scales the heights of heavens.
I am the Mountain cloud that showers a rain of flowers

The atmosphere of the garden of my verse preserves
and prolongs life.
I am its gardener, but its spring
And its foundation are as strong as eternity,

Iqbal's Inferno

With imagination as my fellow traveller,
I rose towards the heavens.
On and on I went, and there was no acquaintance of
mine.
The stars gazed at me in astonishment,
As my errand was a closed secret.
I found myself beyond the limits of days and nights.
Oh, what a beatiful place paradise is!
An ideal treat for eyes and ears.
Birds sent forth a flood of music from the branches of
Tooba.
Hoories displayed their charms unrestrained.
Beautiful Saqis held cups in their hands
the reverller cried "drain ,drain."
At a distance from paradise I beheld a dark region, cold
and silent,
As dark as the fate of Majnun, or the looks of laila,
So cold that it would make even the coldest nook of the
globe hide its face in shame.
When I enquired about it. the reply of the unseen guide
was surprising;
"this cold region is inferno, devoid of fire and light.
Its flames are imported,
which make the sensitive souls quake with fear.
The earthly people, who enter this region,
bring their own fires with them."

astonishing propriety and comprehension.

Iqbal was not an escapist. He did not try to sublimate his dissatisfaction with life in the emptiness and to conceits of sainthood or abstractions. He lived and thought intensely. He was as alive and alert as his ***"Shaheen"***. convarsation with him was an intellectual adventure. To be derisive about modernity or to idealize the good old days was not his object. He was free from the "civilization complex" which misrepresent everything and is ever preoccupied with white- washing lies. Iqbal's work is completely expressive of his personality.

His genius was eclectic. His eyes could see beyond the lotus-land of India, and beyond the horizon itself. His was not a one-track mind. He loathed shams and revealed the numerous facts of experience stark naked, stripping them for the public gaze. He strove to make man feel the one living God-head, the light which is in man himself. sometimes he grows wings and sails among the stars, producing masterpieces of rare and exquisite excellence.

THE MORNING STAR

The morning star wept and said,
"Eyes are granted to me but no chance of observation
The sun has instilled life into all beings,
I am the only that could not find shelter in the lap of dawn.
How brief is the span of a morning star!
The breath of a bubble or the dying flame of a spark."
I said, "O ornament of the radiant of face dawn,
Does Mortality shocks thee? Come down to the earth,
Drop down from the heavens with dew.

Iqbal

Iqbal is undoutedly one of the greatest poets of the East, an immortal, an all-time singer of universal and lasting appeal. He was a profound scholar and a full fledged philosopher whose medium was poetry.

Iqbal fought for freedom, preached love and praised action. With him all belief was subject to revision in the light of new evidence, as he himself once remarked during a conversation with Professor Khaleefa Abdul Hakim, "A man is alive as long as he retains the capacity to accept new ideals the moment this faculty leaves him, he ceases to be" His change from nationalism to internationalism seems to be an unexpected twist, but is fully conversant with what preceded it. Thus he advanced from strength to strenght always on his way to higher and brighter spheres of mental and spiritual experience.

Love is the motive power of Iqbal's songs. It is the meaning of all things that are. He hated hatred scorned coercion and tyrrany. "Mard-e-momin" was his ideal of whose praise he has sung in many of his pages.

Iqbal's philosophy was dynamic. He proclaimed that passiveness is tantmount to death, and that it is the urge to attain one's own ideal, the magnetism of desire, the volcanic propulsion towards the objective which are the only ways in which man can add more and more rungs to his ladder.

Iqbal has penetrated into all religions and creeds, ancient and modern, and has commented upon most of them with an

His last words whisphered on the 21st of April 1938 into the ears of his old and faithful servant, Ali Bukhs, as the soul was leaving the body,— " I have not been afraid of death; I am a Mussalman and shall welcome death with a smiling countenance," While revealing yet another side of his noble nature, recall his own lines in ***Shikwa***,

"In one row stood Mahmood and Ayaz
Neither was he a master nor he a slave."

And again

"Hark! the sign of the virtuous one,
To thee I unfold.
When to him the Angle of Death approaches
On his lips a smile you behold."

It was only a few months ago (7th January),1938 that the sixtieth birthday of the great poet was celebrated all over the length and breadth of this great country with pomp and rejoicing, and the universal encomiastic tributes paid to the Man and the Poet reveal the love and the veneration which all Indians entertained for him. As Mrs.Sarojini Naidu so charmingly put it, he was "one of the supremely great poets of the Indian Renascence and the true laureate of Islamic Asia."

The last verses that fell from his lips, here the curtain was rung down on his earthly life are so wishful and characteristic of him:

"This minstrel played on his lute a while in this age
But, oh! will another wise one follow me."

Verily, the Muses shed tears over the laureate hearse of Iqbal. Sir Muhammad, however, is not dead; his soul is imperishable and it has only lapsed into the star-world.

This was inspired poetry surging forth from a throbbing restless passion, revealing somtimes a marvellous delicacy and quite often the savage wildness of the ***Wali***. In the words of Dr.Nicholson, his eminent translator, his poetry is ever new and inspiring, " a fiery incantation scattering ashes and sparkes and bidding fair to be ' the trumpet of prophecy.'" A study of his poetry shows as if in spectrum analysis the many aspects of his genius, chief among which stand out patriotism, fervent adoration of beauty, and a noble idealism commingled with deep perception of the great metaphysical truth that runs through the universe as does the thread through the garland of flowers. He brought of Hafiz and Saadi. His ***Ghazals*** written in the style of the ancient poets will live for ever, such for example the one on love:

"Love painteth red the tender tulip petals,
And lo! our life with anxious recklessness."

In his ***Workman's Song*** his response to the triple ideals of Equality and Liberty and Fraternity, to which as a true follower of the Prophet he had devoted his life, is fully given expression to. He emphasised in his writings and talks that in Allah's eyes all are equal and no Moslem is a ture Moslem unless his heart is pure with the "Charity of the great". In one of his impassioned moments he cried out in song:

" O Moslems! I will un-moslemise ye by my song
If you think your neighbour is other than yourself."
His heart goes out for the poor and the down-trodden:
" Clad in cotton rags I toil as a slave for hire,
To earn for an idle master his silk attire,
The Governor's ruby seal 'tis my sweat that buys,
His heart is gemmed with tears from my childern's eyes."

The moon near by overheard what then was said
As soon through the skies the saying spread,
Until at length it reached the Morning Star,
And he to Dawn conveyed the answer dread.

The Dawn to Dew retold it word for word,
And thus an earth-born creature also heard
A matter of high Heaven. Next't was the flower
Received it with a tear, at heart sore stirred.

Then dark with grief e'en the bud's wee heart;
From garden bowers did weeping Spring depart!
And Youth who there had strolled for pleasure's sake
Sick-souled turned slow away with sorrow's heart."

A notable feature of Iqbal's poetry is the happy blending of philosophical meditation with poetical emotions. This is illustrated by his double allegorical poem, ***The Candle and the Moth,*** about man and his aspirations, the candle symbolising the light of Wisdom and the moth the individual soul hungering for and hankering after Knowledge Divine. It is again a poem signifying the parable of moral strength which serves to illustrate the great truth that by complete annihilation of the self alone can be realised the personal love of the Beloved. As observed by Principal Sayidain, "For Iqbal poetry is genuine and significant only when it impinges dynamically on life, deepening its appreciation, quickening its pulse, and interpreting its fundamental purposes. In his poetry he combines the elucidation of eternal values with a discussion of current problems." In sir Akbar Hydari's words "Iqbal's poetry is a unique mingling of mysticism, philosophy and Nationalism."

Sir Muhammad Iqbal's poetry has an imaginative glow, a fineness of perception, a language bedecked and be-jewelled,

was always a born fighter and a vigorous propagandist. "He is a leader. He sweeps everything before him like a great wind swirling through a forest of pines. He would recreate Islam, an active, non-sensual, non-imperialistic Islam".

By his writings Sir Muhammad Iqbal had built for himself a niche in the temple of fame. He had achieved a world-wide reputation. His works have been translated not only into English but into. Arabic, Turkish and Russain as well. In Germany has been established an Iqbal Society for the study of his poetry and the propagation of his philosophy. By his translation of the Sanskrit ***Gayatri*** into Urdu he sought to signify and symbolise his supreme and unshakeable belief in the "Unity of the All-inclusive Ego who creats and sustains all egos from which follows the essential Unity of Mankind".

To Iqbal, Nature is only a background for the play of man's emotions. His poems on the ***Himalayas***, the ***New Moon*** and the ***Banks of Ravi*** are instances of his keen appreciation of the beauties of Nature and his responsiveness to its allurement and fascination. He felt as if Nature whispered into his ears the soft melody that creats life.

His "Plaint of Beauty" a dianty lyric, expresses regret in forceful and plaintive language that beauty is short-lived.

" 'Great God!'—thus Beauty to Allah Cried-
'Ah! why is immortality denied
To me on earth? Am I not lovely there?'
And Lo! an awful voice to her replied:
'The world an empty picture-show was made,
Where changing non-existence is displayed,
A night of nothingness is all its tale;
None there can beauteous be who do not fade.'

Sir Muhammad Iqbal chose as his medium of expression Persian, rich in its vocabulary and terms of expression and eminently fitted therefore to convey his high-flown thoughts with grace and charm.

"Although the language of Hindi is sweet as sugar
Yet sweeter is the fashion of Persian speech."

But many and inspiring are his verses in Urdu- "the sweet language of Hind". ***Bangi Dira*** published in 1924 is an anthology of his Urdu poems; and since then have been published ***Javid Namah, Musafir, Bal-i-Jibriel and Dharb-i-Kalim.*** He had enriched Urdu poetry by the infinite variety of themes chosen by him for treatment-Love, Religion, Philisophy, Nationalism, Pantheism and Pan-Islamism. He introduced into Urdu the touching metaphors and the tender images of Persian, Punjabi and other Indian dialects. He believed that national India required a national language and he sought to mould Urdu into shape and to modernise it.

"The comb seeks the locks of Urdu to tame,
This wild hearted moth still burns on the flame".

In 1929 he delivered six lectures at the Lawley Hall, the Anjuman, Madras, on Islam, which have since been published "under the title of Reconstruction of Religious Thought in Islam," He there attempted to reconstruct Muslim religious philosophy with due regard to the philosophical traditions of Islam and the more recent developments in the various domains of human knowledge. One may not agree with everthing that Sir Muhammad expressed, but one cannot but give credit to his transparent sincerity and religious fervour, his vigour of expression and catholicity of views. His rhetorical writings are all characterised by intense fire and spirited expression for he

We will dispense to all worshippers the wine of love.
Power and Peace is in the song of the devoted;
The true end of man on earth is to love each other."

His virile optimism soars into lofty heights and drinks deep of the "Joy of Living". No wonder he has no patience with the platonic ideal of life as mere death. Plato he condemned as "that old philisopher of sheep" and treated the plantonic illusion and non-progressive idealism with withering scorn and sarcasm in the following lines:

"Plato, the prime ascetic and sage,
Was one of that ancient flock of sheep;
His Pegasus went astry in the darkness of Philosophy
And galloped over the mountains of Being.
He was so fascinated by the Ideal
That he made eye and ear of no account."

Iqbal was conscious of the destiny of a poet as a prophet and proclaimed of himself:

"I have no need of the ear of to-day
I am the voice of the poet of tomorrow."

His ***Payam-i-Mashriq*** (message of the East) dedicated to Amir Amanullah of Afghanistan was a worthy reply to Goeth's "West-Oestlicher Divan". It was written in Goethe's own style and gives philosophical explanations to the many important problems in human life and the relation of man to God. Of western life and thought Sir Muhammad complains:

"Amassing love, thou hast lost thy heart to-day
Ah, What a precious boon thou hast given away."

In whose sabres lay hidden life-scorching flames,
Whose birth tolled the knell of effete ideals,
With whose fear the strongholds of falsehood trembled,
Whose electric touch revived life into the world,
And broke the chains of superstition.
Once thou wert the cradle of civilisation of this race,
The fire of whose glance was world-captivating beauty.
To Sing the dirge of thy ruin has fallen to my lot;
This torture-Yea, self-torture, was reserved for me.
Tell me of thy anguish; I too am full of pain;
I am the dust raised by that caravan which
Once broke its journey here.
Paint me that picture of old,
Rouse me by telling the tale of bygone days;
And I shall carry thy gift to India,
And make others weep as I weep now."

The glorius past of Islam was the breath of his nostrils and the glorious future of pan-Islamism was ever the vision before his mind's eye.

He was not a mere poet but a poet of humanity. "His intellect sweeps the centuries and his language is set in the rhythm of the rise and fall of ages and races." He imagines in an "Erewhon" of Peace, Love and Universal brotherhood. His ***Nya Shiwala*** (new tabernacle) is a ***locus classicus*** showing his love of mankind.

"Our Pilgrimage will be higher than all the pilgrimiges of this world,
We will raise the pinnacles of our temple to meet the very edge of the sky,
We will rise every morning to sing sweet hymns,

The finite centres of experience are for Sir Muhammad Iqbal the fundamental facts of the Universe. The Hegelian Absolute, the Vedan ic Brahman, the Sufi God-these are, in his opinion, fictions of the mind, hallucinations of the neurotic imagination. To him all life is individual; there is no such thing as universal life. God himself is an individual. Individuals partake of the nature of God. Man not only absorbs the world of matter by mastering it; he absorbs God Himself into his ego by assimilating divine attributes.

Sir Muhammad Iqbal was a great patriot but his patriotism was not of the narrow type. It revealed a transcendental internationlism and a width of outlook very refreshing in an age when loyalty and patriotism were conceived on a sectarian and sectional basis. The poetry of Milton is no more engrossed in the affairs of the State during the Great Rebellion, the poetry of Dante enmeshed with the Florentine politics of his age, than was Iqbal's poetry with the storm and stress of events that clouded the political horizon of India. The Surge of patriotism so characteristic of the age is there. The past glory of the Muslims raises in his imagination a vision-splendid, and in powerful and unforgettable lines he reproaches his fellow men for their present degradation and disintegration. Tears trickle down his cheeks and he gets choked with emotion as he beholds the fair Sicilian coast that once formed a part of the great Ottoman Empire, and he cries out:

> "Weep to thy heart's content, O blood-weeping eye!
> Yonder is visible the grave of Muslim Culture.
> Once this place was the tent of those dwellers of the desert
> For whose ships the ocean was the playground,
> Who raised earthquakes in the courts of mighty Emperors

of poetry. "It is the melting of all philosophy by the fire of his genius to express his manly feeling at the sight of that weakness in man which is the cause of all his distress." This book took the younger generation by storm. Herbert Read in his interesting and informed critisim of the poem remarks: "A poem that crystallises in its beauty the most essential phases of modern philosophy, making a unity of Faith out of its multiplicity of ideas, a universal inspiration out of the esoteric logic of the schools." The English translation has an added value to us in that Sir Muhammad has in an introduction given in his own words a brief and succinct summary of his philosophical outlook on life. In 1918 followed ***Ramuz-i-Bekhudi*** (mysteries of Selflessness), which deals with the life of the Muslim nation on lines parallel to the previous poem. Poetry and philosophy are, observes Dr. Syed Abdul Latif, "So inextricably intermixed that his utterence appears to me neither pure poetry nor pure philosophy. It is a mixture of the two blended into a political mysticism transcending them both."

These poems are semi-philosophic musings in verse dealing with the entire problem of man, and Iqbal pleads for a reversion to the simpler and more vigorous life of the ancient days when the early Muslims practised the preaching of the Prophet. The cardinal principle of his dynamic philosophy, which won him world admiration, is contained in these works of his. He there sings:

"The form of existence is an aspect of the Self,
Whatsoever thou seest is a secret of the Self."

In his view, Action is the main spring of life seeking to perfect the Self, and

"Subject, Object, means and causes—
They all exist for the purpose of Action."

garden,
Else how should the nightingle have known that roses are."

Muhammad Iqbal returned to Indian in 1908 and began the practice of law, but his leisure hours he devoted to poetry. Success in life and honours came thick on him; he was knighted in 1923 and in the following year was elected to the Punjab Legislative Council.

He was a delegate to the Round Table Confernece held in London in 1932 and held the presidentship of the Muslim League with distinction for some years. When the Afghan Government decided to establish a University at Kabul it was Sir Muhammad Iqbal who was invited by that Government for advice and guidance. And at the last Convocation, the Osmania University honoured itself and the great poet distinguished savant by conferring on him a Doctorate of Letters.

The personality of Sir Muhammad Iqbal is a many faceted one. He was not only an inspiring philisopher; for more mundane things too he found time. His handbook on Economics written in Urdu in his profesorial days, though no longer in print, was well written and well read. In the field of philosophy his ***magnum opus*** was his early thesis on the Developement of Metaphysics in Persia, which won him the doctorate of a German university. This was published in 1908 and because of its sound judgement and illuminating exposition is still holds the field unrivalled. In 1915 was first published his long philosophical poem in Persian, ***Asrar-i-Khudi***, the treasures of which have been made availabe to the English-knowing world by the eminent Dr. Nichloson's translation ***Asrar-i-Khudi*** deals with the life of the individual Muslim and is modelled on the famous ***"Masnavi" of Rumi.*** It is more of philosophy than

A slender bough to rest a nest is no safe position".

Again in the ***Khizr-i-Rah*** he continues:

"The democracy of the West is the same old organ,
Which strikes the selfsame note of Imperialism;
That which thou regard'st as the fairy Queen of Free dom.
In reality is the demon of autocracy clothed in the garb of democracy.
Legislature, reforms, concessions and rights
In the materia medica of the West are but sweet narcotics.
The heated discussions at Peace conferences,
Are but the comouflage of capitalists.
Thou takest mere illusion for a garden,
O thou fool! a cage for the nest"!

His severe disapproval of the modes and manners of the West does not however prevent him from gratefully acknowledging the immense benefit he derived from his sojourn in England. He was no believer in the dictum of the prophet of Imperialist Jingoism, Rudyard Kipling, who wrote, "Oh East is East and West is West, And never the twain shall meet." He was firmly convinced of the great benefits an Indian derives from a stay in England and Europe, and in verse, sweet and ornate, melodious and fragrant, he wrote:

"An eastern tasted once the wine in Europe's glass
No wonder if he broke old vows in reckless glee.
The blood came surging up in his new-born thought;
Predestination's bond-slave, he learnt that man is free.
Let not thy soul be vexed with drunkard's noise and rout!
O Saqi, tell me fairly who it was that breached the Jar.
The scent of the rose showed first the way into the

to have had much time for poetry but his verses of that period bear the impress of Persian Romanticism. Love and its relation to beauty provided mainly the theme. True to the Oriental traditions he regards earthly love as a stepping stone to Divine Love.

"The fountain of life is Love's flashing sword.
The hardest rocks are shivered by love's glance,
Love of God at last becomes wholly God!
Learn thou to love and seek to be loved"

and again

"The song of love for Him fills my silent reed
A hundred notes that are in my bosom.
How shall I tell what devotion He inspires?
My dawn rises from the sun of His heart".

In poems like ***Kali*** (buds), ***Tanhai*** (solitude), and ***"An Evening Near the River Neckar Near Heidelberg"*** his imagination transcends all limits of space and time and peers into the beyond of Divine Love. That God-intoxicated genius, Swami Ram Tirath, strikes a sympathetic chord in his breast and his song to him is at once touching and sublime and gives us glimpse of the Deep.

He realised that the congested soul-less materialistic civilisation and thought of Europe were uncongenial to his youthful outlook on life and his orientalistic raptures of love, and in his poem, ***March 1908,*** he warned the West of the dangers of a blind devotion to sordid materialism:

"O Ye that in western lands reside, learn,
God's home is not a business concern,
The gold you think is pure, soon shall impure turn
A suicide's death awaits your civilisation;

The year 1900 witnessed his stepping on to parnassus. At one of the ***Mushairas*** he read his lyric, ***The Himalayas,*** which at once proclaimed him as the national poet of India. The influence of both English and Persian culture and literature is discernible clearly in his writings, which, while they are no more translation, reveal in a marked degree his assimilation of western poetic ideas. ***Hamdardi*** (sympathy) and ***Pyam-i-Subh*** (message of the Morning) recall to our memories Cowper and Longfellow; and we see the echo of Tennyson and Emerson in ***Isk aur Maut*** (Love and Death) and ***Rukhsat-Ai-Bazm-Jahan*** (Farewell O! World), and Walt Whitman's ideal of Pragmatism is seen reflected in the "***Secrets of the Self***".

After taking the degree of Master of Arts he was for a time Professor of History, Philosophy and English at the Lahore College. His insatiable thirst for knowledge took him in 1905 to England, where he came into personal contact with reputed scholars and Indologists like McTaggart, the Hegelian, Browne, the author of the History of Persian Literature, R.A. Nicholson, then Professor of Persian at the Cambridge University, and Sorely, Professor of Moral Philosophy. Incessant study and deep research for three years bore fruit in his thesis on the Development of Persian Thought which earned for him a Doctorate of the University of Munich, in Germany. Returning to England he joined the London School of Political Science and about the same time was called to the bar. In London he delivered a series of six lectures on Islam. His vast erudition, his refreshing catholicity and his penetrating critical acumen won for him wide admiration, and when shortly afterwards Professor Arnold went on leave the choice fell on Muhammed Iqbal and he was called on to fill the distinquished Chair of Arabic at the University of London.

During his stay in England Muhammad Iqbal does not appear

"He lisped in numbers for the numbers came." And even his lispings reveal a masterly perfection of sense and rythm that raises him from the level of a mere versifier to that of a genius. His earlist known composition contains the following lines, which for the high philisophic sense that it embodies is indeed a rare gem of poetic art.

"Divine Grace the dew of remorse has gathered.
Thinking them pearls, as they studded my forehead".

About this early efflorescence of Iqbal's genius, Nawab Sir Zulfiqar Ali Khan of Malerkotla expressed himself thus: "In one sublime verse the poet depicts the angelic sanctity of a soul after its resurrection, how the Divine Love rejoices to see the ennobling virtue of remorse. Supremely exquisite is the analogy of drops of perspiration to pearls whose purity resembles the chastity of the awakened conscience. This poetic euphony which embellishes the dignity of the human soul with incomparable vesture lays claim to be enjoyed as a free work of art". It was, however, reserved to Nawab Mirza Khan Dag Dehlawi, an eminent poet and tutor to His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad, to discover the budding poet and to draw out his latent talents. His days at the Scottish Mission College, Sialkot, were most useful and marked the turning point in his interesting career. There he came under the influence of Shams-ul-Ulema Maulana Syed Mir Hasan, his tutor, who created in his pupil a genuine and abiding interest in philosophic studies and a zest for rich classic lore, Sanskrit, Arabic and Persian, and for the history of Islamic culture. At the Lahore Government College he found in Sir Thomas Arnold, the pre-eminent Orientalist, a friend, philosopher and guide, who early recognised and kept alive the ***celestial fire - poeticus furor-*** in the heart of Iqbal.

9

T.R.PADMANABHA CHARI

The Late Sir Muhammad Iqbal

"Thou art Fire; fill the world with thy glow
Make other's burn with thy burning!
Up, and reinspire every living soul!"

The recent death of Sir Muhammad Iqbal is more than a national loss. In him we have lost the doyen of Indian renaissance poetry and an illustrious pioneer of Indian national revival. If Mrs. Sarojini Naidu is a poetess and a politician, if Dr. Sir Rabindranath Tagore is a poet and a philosopher, Sir Muhammad was all the three; in him poetry, philosophy and politics blend harmoniously, and he stands out an idealist, his head in the clouds of romance and metaphysics, his feet firmly fixed on the ***terra firma*** of materialistic thought. A great poet and a profound scholar, his share in strengthening the Indian national and literary revival was indeed great: His contribution to Muslim society as a whole, in Turkey, Persia, Egypt, Afghanistan and Arabia, and to the process of their regeneration has been of vast value, for it was he who inspired the poetic philosophic consciousness of those lands.

By birth as well as education Sir Muhammad Iqbal was marked out for a place in the "Cloud-Cuckoo-Land". Two of the noblest races blended in him, as also the oldest cultures of the world. Born in 1877 at Sialkot, he was, as it were, cradled in the Sufistic thought and the mysticism of Jalaluddin Rumi. His education also prepared him for his destined course and during his school days he was known as a devout student of Arabic and Persian classics, as also of Urdu poets like Ghalib and Hali. To him poetry came early in life with a wonderful spontaneity.

day subconsciously feeling the need of a federated Europe, feeling the need of a unity which the Christian church organisation originally had given them, but which instead of reconstructing in the light of Christ's vision of human brotherhood, they considerated it fit to destroy under the inspiration of Luther. Iqbal, therefore, feels certain that as the modern world will pass through the throes of its own civilization and see its own handworks shattered by its own hands piecemeal will it be-take itself to the humanism that should prevail to unite mankind.

Till then he would insist that wherever even a semblance of that humanism exists, whether in the East or in the West, and by whatever name it goes by, it should be preserved, at all costs, as a noble heritage of mankind.

racy of the Western states of Europe does not fit into his humanism. Nor has he any gentle word for the Communistic order of life in Soviet Russia, or for Facism or Nazism. Marx, he thinks, would like to idealize equality of bellies, and Nietzche, the inspirer of modern Germany, would exult at the elimination of the weak. Even the League of Nations, he thinks, is a society formed to parcel between themselves the shrouds of dead bodies. Iqbal's humanism would have none of these. He fully recognises the immense value of the sciences that Europe has developed. But he bewails the fact that the human touch is lacking. In moments of trial, they betray humanity, in the name of territorial nationalism! He also would heartily appreciate the life of action which characterises Europe, but is grieved to see that action does not express itself in the universal good of all mankind. His faith therefore holds anchor in the humanism he identifies with Islam; and even when he looks at the condition of those who are the recipients of this heritage, viz., the Mussalmans of Arabia, Egypt, Syrai, Turkey, and Iran, he fails, to see that humanism existingin their midst in any striking form. The European sense of nationalism has cast its snare so powerfully all round that he fears that it may racialize even their outlook.

LOOKING 'FORWARD'.

But Iqbal does not fall into despair. He believes that the Islamic humanism is still a living force and will work for freeing the outlook of man from geographical limitations, and that "it is itself destiny and will not suffer a destiny". He feels that Europe is gradually realising the initial mistake it made in trampling over the moral and religious convictions of Christianity and resolving itself into a set of mutually ill-adjusted states dominated by interests not human but racial and territorial. He feels that even these mutually ill-adjusted states are to-

PRESENT DEPRESSION.

It is under the searchlight of this humanism that he looks at the world and ponders over its problems. The talk of nationality in India seems to him but a hall ow talk. The basis for that common moral consciousness which alone could bind a people is absent here, he thinks. India is to him Asia in miniature, a congerie of caste units showing no inclination to remove the divisional basis of their several group-lives and sink their respective individualities in a composite larger whole. He thinks that true democracy cannot thrive on a foundation such as this. The formation of a common moral consciousness calling for social equality which is the essence of a nations; demands a price, which Iqbal thinks, the people of India are not, at this moment, prepared to pay.

Under the same searchlight, he looks at Europe, and the sight fills him with grief Says he in the ***'Khizr-i-Rah'***.

"The democracy of the West is the same old organ,
Which strikes the selfsame note of Imperialism;
That which thou regard'st as the fairy Queen of Free dom.
In reality is the demon of autocracy clothes in the garb of democracy.
Legislature, reforms, concessions and rights
In the materia medica of the west are but sweet narcotics.
The heated discussions at Peace conferences,
Are but the comouflage of capitalists.
Thou takest mere illusion for a garden.
O thou fool! a cage for the nest"!

The above outburst is due to the fact that the democ-

recognise it as the mainspring of his genius. If, as in the spiritual vision of his ***Jawidnama***, India interests him, if it pleases or displeases him in this or that aspect of its life, it is because he allows himself to react to it as a humainst; if he feels distressed over the present day condition of the Muslims all over the world, it is his humanism that feels afflicted; if Europe to-day looks to him a wilderness of aggressively selfish nationalities, it is the humanism in him that revolts.

Iqbal stands for all that is beautiful in life and holy and of good report: and he is anxious to see the world fashion itself out under its living inspiration. He wants to see human life take a stand on its own human dignity, and set itself free from narrow tribal, racial, class or territorial temptations, and evolve a brotherhood extending to the ends of the earth which howso-ever distributed into groups by the exigencies of time and space should hold together a common moral conciousness, and be linked to each other by the ties of common humanity. That is the order that he would like to see established on earth and to which he has dedicated all his Muse.

Iqbal's humanism is a matter of conviction to him. As a student of world history he has been inspired by humanistic movements throughout the ages. His writings reveal the influences of the classic humanism of the West, glowing in the course of history into Christian impulses; they reveal also the influences of the humanism of India, and even of ancient Iran. But the humanism that has captured his mind and soul is the humanism of the Semitic land, standing midway between the East and the West, the humanism which has given to the world a Christ and a Muhammed— humanism that brushes aside all barriers of colour and race and country that stands in the way of the fullest fellowship between man and man all over the globe.

better language! They say that he started as an Indian nationalist and developed into a pan-Islamist; they even call him a champion of aggressive Islam.

Gentlemen, if you believe me, Iqbal will outlive the momentary use of all these terms, because none of them really reflects the truth about him. As every young man, he at first liked the Immediate. That is the feeling of every one who passes from childhood into adolescence and from adolescence into youth; it is the Immediate that attracts. Knowledge and life are at this stage circumscribed, and one begins to think that the best in life is in himself and in that which he finds near about him, and he idealizes his own home and he fancies that the rest of the world is of no consequence and is necessarily of an inferior order. So has it been with Iqbal. Before he grew into manhood, he sang of India. That was a time when a wave of nationalistic thought was mildly touching the intellectual classes in India; and Iqbal sang of the land of his birth and of the beauty that he fancied it possessed. And then begins his manhood. It opens its eyes in the atmosphere of Europe. The time of manhood is one of experience, of adjustment of values, and this experience he brings with him as he returns home. And then follow reactions to this experience pushing him forward into a state of maturity. If you want to understand Iqbal, you have to bring the whole of his life under review. You cannot cut him into sections and subject him to indifferent evaluation under the stress of unkind political catchwords.

I have tried to understand the mind of this poet and have followed, at times, a very searching line of analysis. And to me, at every stage of his poetic growth, he has appealed pre-eminently as a humanist. Humanism serves as a perennial background to all his utterance. Sometimes it is so pointedly in the fore-ground that it will be sheer unkindness not to

that look and inwardly listen to something of that note even from here.

The look is that of a political mystic born to poetry. The note is the note of humanism drawing inspiration from the eternal verities of human life. Wearied in body, and weariness reflecting itself from every feature of his countenance, he retains that glance of his eye which has kept him company all through his life, the glance of a political mystic piercing into the dark spots on the life of nations to comprehend a life to come, a life of emancipation for humanity from the self-imposed shackles of social, intellectual, economic and consequent political thraldom. That is the glance of Iqbal. Now note the voice that proceeds from him. A malignant disease of the throat has rendered that voice somewhat hoarse of late; but its hoarseness cannot conceal the sharpness of the painful ring that it strikes echoing all round the disturbance gathering in his soul by the fearful reaction of his external world divided into jarring political creeds, born of narrow racial or territorial nationalism bent, as he thinks, on its own destruction. That glance of his eye and that ring of his morning voice will live in his poetry to warn and inspire the coming generations because the glance is rivetted on the primary, weaknesses of human nature, selfishness, and greed, and exploitation of the weak, and because the voice speaks but the truth which alone will save human life, the truth as handed down to him by a successive order of sages and prophets who have worked for the unification of the human race.

"THE HUMANIST"

People have called him by all sorts of names. It is so easy to give names—without knowing! Some call him a communalist, a reactionary. Some go a step further and use

'POLITICAL MYSTICISM'.

I have used the expression 'Political Mysticism' to designate the effect Iqbal has left on me That expression, I should think, sums up his contribution to world thought at this moment, and I have no doubt in my mind that posterity will judge and remember him by that contribution. It points to an eternal message of life such as has always dwelts in the very soul of nature; and holds out an ideal of corporate life for mankind such as is so sorely missed at this hour every-where.

I know, in this great gathering there must be scores of men and women, who have read the poems of Iqbal times out of number and they will bear me out that the poet is spiritually averse to speaking out his mind in clear matter of fact language. In the ***Jawidnama*** he himself confesses:

> This artifice of words is of no avail;
> It does not at all express what my heart contains.
> I have disclosed many a secret;
> But one there is which words never sustain,
> The more I speak of it, the more intricate it grows.
> The word and its sound drown it into deeper obscurity.
> Catch it from the glance of my eye!
> Catch it from my plaintive morning note!

So, you and I have to catch the meaning of his painful music, his poetry, from his own look or from the plaintive half suppressed note that goes out from him every morning the moment he opens his eye to the realities of the opening day. Only recently, I had occasion to dwell with him for a little while under the same roof at Lahore and catch something of his look and listen to something of his plaintive morning note. What is that look like and that note? Try to review his entire poetic output in one quick glance and you can visualize something of

Dr. SYED ABDUL LATIF

Iqbal and World Order

Addressing a distinquished gathering on the Iqbal Day held at Hyderbad-Deccan on the 7th January 1938 under the presidency of His Highness the Prince of Berar. Dr.Syed Abdul Latif said:—

Iqbal is not merely a great poet but a great philospher; and I have wondered whether I could lay emphasis on any one of the two roles more than the other. There was a time when I read his poetry with enthusiasm and tried to catch its strains and follow him into the depths of his feelings or soar with him along the flights of his imagination or fancy. But that was when I could feel poetry for its own sake. As years have advanced, interest in life's poetic expression has had to demand something more than mere aesthetic self-satisfaction. And there have been moments when I have tried to catch the strains of his philosophy as well; and to look at the world, its history, its problems, its very future through the inspirationai vision that his philosophy has supplied. That poetry I could still feel today and the voice of that philosophy still hear; but sectional approach to him seems for me now well-nigh impossible. The two are so inextricably intermixed that his utterance appears to me neither pure poetry nor pure philosophy. It is a mixture of the two blended into a political mysticism transcending them both. And so, as I look back at this hour on all his poetic achievements and inwardly wade through the entire range of his poetic experience, what picture of a poet does he flash across my mind? What does he stand for through all his utterance? That is the subject of my immediate interest and I propose to give you only a synopsis of it.

Contents

1. Dr. Syed Abdul Latif — Iqbal and World Order — 1

Osmania Magazine, Vol. II , No. 1 & 2, 1938

2. T. R. Padmanabh a Chary — The Late Sir Mohammed Iqbal — 9

3. Mir Hasan — Iqbal

Osmania Magazine, Vol II, No. 3 & 4, 1938

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Hyderabad.

APRIL, 1994

SPECIAL ISSUE

Articles published on Iqbal,
in Osmania Magazine, 1938
(the year of the poet's death)

IQBAL ACADMEY, HYDERABAD
Madina Mansion, Narayanguda
Hyderabad - 500 029, A.P., INDIA.
Phone : 595230

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Hyderabad.

APRIL. 1994

SPECIAL ISSUE

Articles published on Iqbal,
in Osmania Magazine, 1938
(the year of the poet's death)

★ ★ ★

IQBAL ACADEMY, HYDERABAD
Madina Mansion, Narayanguda,
Hyderabad - 500 029, (A. P.) INDIA.
Phone : 59 5230